قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

ماہنامہ ——— لاہور

قیمت فی پرچہ	ٹیلیفون :- ۸۸۰۸۰۰	بدل اشتراک
۴ چار روپے	خط و کتابت ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵-بی گلبرگ ۲ لاہور	سالانہ پاکستان /۴۸ روپے غیر ممالک /۹۸ روپے
شمارہ-۷	جولائی ۱۹۸۵ء	جلد ۳۸

فہرست

۱۔ لمعات ——— ۲

۲۔ حقائق و عبر (i) قابلِ تقلید (ii) اور وہ بھی کہتے ہیں! ——— ۷
(iii) قرآن کی خدمت کے پردے میں سرمایہ دارانہ نظام کا تحفظ

۳۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ (ثریا عندلیب صاحبہ) ——— ۱۳

۴۔ زمینداری اور جاگیرداری کا نظام اسلام کے خلاف ہے ——— ۱۷

۵۔ پیامِ عید (قرآن کی عظمت)... (علامہ پرویزؒ) ——— ۳۴

۶۔ مودودی صاحب اور انسانی خلافت کا نظریہ (شاہد عادل) ——— ۴۷

۷۔ داغوں کی بہار (مسلسل) ——— ۵۰

۸۔ افکارِ پرویز کی صدی (مسلسل) (محمد اسلام صاحب) ——— ۵۴

ایڈیٹر: محمد خلیل، ناشر شیخ عبدالحمید۔ مقام اشاعت: ۲۵-بی گلبرگ نمبر ۲ لاہور مطبوعہ اشرف پرنٹنگ پریس ۹ ایبک روڈ لاہور

لمعات

وزیرِ خزانہ پاکستان نے، نئے سال کا بجٹ قومی اسمبلی میں پیش کرتے ہوئے، ملک عزیز سے کالے دھن کے خاتمے کے لئے کچھ اقدامات کا اعلان کیا ہے۔ کالا دھن وہ رقم ہے جو رشوت، چور بازاری، سمگلنگ، ٹیکس چوری اور دوسرے ناجائز ذرائع سے اکٹھی کی جاتی ہے، یہ مسئلہ ہماری مختلف حکومتوں کو پیش رہا ہے اور وہ اسے ختم کرنے کے لئے مختلف اقدامات اٹھاتی رہی ہیں، ماضی میں اس کا مؤثر طریقہ، پرانے کرنسی نوٹوں کو منسوخ کر کے، نئے کرنسی نوٹ جاری کرنا تھا، اور اس کا خاطر خواہ نتیجہ سامنے آتا۔ لیکن تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد کرنسی کا تبدیل کرنا، حکومت کے لئے ممکن نہیں، اس دفعہ بھی بجٹ سے پہلے اس قسم کی قیاس آرائیاں کی جا رہی تھیں، لیکن حکومت نے اس کی بجائے ایک دوسرا فیصلہ کیا ہے۔

اب فیصلہ یہ کیا گیا ہے کہ کالے دھن کو باہر لانے کے لئے حکومت کی جانب سے خصوصی بانڈ جاری کئے جائیں گے، جن کی مالیت ایک سو روپے ہوگی لیکن وہ نوّے روپے میں فروخت ہوں گے اور دو سال کے بعد ان کے عوض ایک سو روپیہ مل سکے گا۔ بعد میں ایک انٹرویو میں، انہوں نے ملک میں کالے دھن کے تخمینے کے بارے میں بتایا ہے کہ اس کا اندازہ تین سو کروڑ سے لے کر دو ہزار کروڑ روپے تک کیا جاتا ہے۔ انہوں نے امید ظاہر کی کہ حکومت کے اس اقدام سے کم از کم ایک ہزار کروڑ روپے کے مساوی کالا دھن باہر آ جائے گا۔ اس سلسلے میں انہوں نے ہندوستان کی مثال دی کہ وہاں کالے دھن کو باہر لانے کے لئے دس سالہ بانڈ جاری کئے گئے ہیں جن کے مطابق دس سال کے بعد ایک ہزار روپے کے بانڈ کے بارہ سو روپے ملیں گے۔

(روزنامہ جنگ جمعہ میگزین، جون ۱۹۸۵ء صفحہ ۵)

حکومتِ ہند سے پاکستانی اقدام کا موازنہ کرتے ہوئے، وزیرِ خزانہ نے یہ تاثر دیا ہے کہ ہم نے اس سلسلے میں فراخ دلی سے کام لیا ہے۔ تاہم اسمبلی کے اندر اور باہر بہت سے لوگوں نے حکومت کے اس اعلان پر سخت تنقید کی ہے، ان کا استدلال یہ ہے کہ کالا دھن بھی حرام کی کمائی ہے اور اس کے ساتھ سود، جو خود بھی ایک حرام آمدنی ہے، ملا کر، اسے جائز قرار دینا اسلامی تعلیمات کے سخت خلاف ہے، بعض لوگوں نے تو یہاں تک

کہا ہے کہ اس فیصلے سے کالے دھن والوں کی چاندی ہوگئی ہے کہ ان کی حرام کی کمائی بھی حلال ہوگئی ہے اور سود کی شکل میں انہیں اس حرام کمائی کا منافع بھی مل رہا ہے، ان لوگوں نے خدشہ ظاہر کیا ہے کہ اس سے کالے دھن میں کمی کی بجائے اضافہ ہوگا اور ٹیکس چوری، رشوت سمگلنگ اور دوسرے غیرقانونی ذرائع آمدنی کی زیادہ حوصلہ افزائی ہوگی۔ وزیرخزانہ نے ان اعتراضات کے جواب میں وعدہ کیا ہے۔ کہ وہ اس معاملے کو علماء کی ایک کمیٹی کے سپرد کرکے ان کی رائے معلوم کریں گے۔

ملک عزیز میں، اسلامی نظام کے نفاذ کے سلسلے میں مختلف اقدامات اٹھائے جا رہے ہیں، کیا ہی اچھا ہوتا کہ اس اہم مسئلہ کو بھی، انہی اسلامی تعلیمات کی روشنی میں حل کیا جاتا۔ اس بارے میں اسلامی تعلیمات اتنی مؤثر ہیں کہ ہندوستان سمیت بہت سے غیرمسلم ممالک نے انہیں عملاً اختیار کرلیا ہے۔ ہمارے وزیرخزانہ صاحب نے اس بارے میں حکومتِ ہندوستان کے اقدام کا حوالہ بھی دیا ہے لیکن اسے صرف بانڈوں کے اجراء تک محدود سمجھا ہے کہ وہاں اس مقصد کے لئے ایک ایک ہزار روپے کے بانڈ جاری کئے گئے ہیں، جو دس سال کے بعد بارہ سو روپے کے برابر سمجھے جائیں گے۔ اس سے انہوں نے یہ تاثر دینے کی کوشش کی کہ ہماری حکومت اس سلسلے میں جو اقدامات اٹھا رہی ہے، وہ ہندوستان کی نسبت قدرے بہتر ہیں کیونکہ یہاں صرف دو سال کے عرصے میں نوّے روپے ایک سو کے برابر ہوجائیں گے۔ لیکن اس مقصد کے لئے ہندوستان نے جو دوسرے اقدامات اٹھائے ہیں ان کا ذکر نہیں کیا گیا۔

کالے دھن کا ایک بڑا حصہ، عیاشی کی چیزوں پر صرف ہوتا ہے اور ملک میں مہنگائی کے اضافے کا سبب بنتا ہے۔ چنانچہ حکومتِ ہند نے بانڈ جاری کرنے کے علاوہ کچھ دوسرے مؤثر اقدامات بھی اٹھائے ہیں تاکہ یہ رقم عیاشی کے کاموں میں ضائع نہ ہو سکے۔ اس مقصد کے لئے جو تین اہم اقدامات اٹھائے گئے، ان کی تفصیلات قارئین کی خدمت میں پیش کی جاتی ہیں۔

ا۔ حکومت ہند نے بانڈ اسکیم کو کامیاب کرنے کے لئے ساتھ ہی یہ فیصلہ بھی کیا کہ ملک کے کسی بھی شہری علاقے میں، ایک ہزار مربع گز سے زیادہ رقبے پر کوئی مکان تعمیر نہیں ہوسکتا۔ یہ رقبہ پونے دو کنال کے لگ بھگ بنتا ہے۔ چنانچہ اب وہاں سارے ملک میں اس رقبے کی حد سے ایک کوٹھی بھی بڑی نہیں، یہاں تک کہ وہاں کے ارب پتی خاندانوں یعنی برلا اور ٹاٹا کے خاندانوں کو بھی اس قانون کی خلاف ورزی کی اجازت نہ دی گئی۔ حکومت ہند کا یہ فیصلہ، بندہ کی نظر سے چھ سات سال پہلے

گزرا تھا، ہوسکتا ہے کہ اب اس سلسلے میں کوئی مزید پابندیاں بھی عائد کر دی گئی ہوں۔

۲۔ دوسرا فیصلہ سونے کے خالص زیورات کے استعمال پر پابندی لگانا تھا۔ کالے دھن کا ایک بہت بڑا حصّہ ان زیورات کے ذریعے محفوظ کر لیا جاتا ہے اور اس کے علاوہ ان سے بے جا نمائش کا کام بھی لیا جاتا ہے۔ جس سے معاشرے میں طرح طرح کی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ خیال رہے کہ دنیا میں زیورات کی ابتداء ہندوستان سے ہی ہوئی۔ حکومت کے اس فیصلے کی سخت مخالفت کی گئی اور سات زرگروں نے احتجاج کے طور پر اپنے اوپر پٹرول چھڑک کر خودسوزی کا بھی مظاہرہ کیا لیکن حکومت ہند نے پابندی واپس لینے سے انکار کر دیا۔ جس کے نتیجے میں کالے دھن والے لوگ حکومت کے جاری کردہ بانڈ خریدنے پر مجبور ہو گئے۔

۳۔ عیاشی کا تیسرا بڑا ذریعہ، نئے نئے ماڈلوں کی کاریں خریدنا ہے، حکومت ہند نے ہر قسم کی غیر ملکی کاروں کی درآمد پر پابندی لگا دی ہے، اور لوگوں کو اس امر کا پابند کیا کہ صرف ضرورت مند لوگ ہی کاریں استعمال کریں اور وہ بھی وہ کاریں استعمال کریں جو ملک کے اندر بنتی ہیں۔ اس کے علاوہ کچھ چھوٹے چھوٹے دوسرے اقدامات بھی اٹھائے گئے مثلاً ائرکنڈیشنوں کی درآمد یا ملک میں استعمال پر پابندی وغیرہ" ان اقدامات کی وجہ سے لوگ مجبور ہو گئے کہ وہ حکومت کی جانب سے جاری کردہ بانڈ خرید کر، اپنے کالے دھن کو جائز بنا لیں۔

ہمارے ہاں حکومتِ ہند کے بانڈ جاری کرنے والے فیصلے کا ذکر تو کیا گیا ہے، لیکن اس کی کامیابی کے لئے وہاں جو دوسرے اقدامات کئے گئے ہیں، ان کی طرف اشارہ تک نہیں کیا گیا، لطف کی بات یہ ہے کہ حکومتِ ہند نے جو یہ تمام اضافی اقدامات اٹھائے ہیں وہ اسلامی تعلیمات کے عین مطابق ہیں، اس لئے ہمارے وزیر خزانہ کے غور کے زیادہ مستحق ہیں کیونکہ ہم بھی انہیں اپنا کر ملک سے کالا دھن، کامیابی سے ختم کر سکتے ہیں۔

پہلا قدم مکانات کے رقبے کی حد مقرر کرنا ہے، یہ ایک عام حقیقت ہے کہ ہمارے ہاں شاندار کوٹھیوں پر لاکھوں روپے خرچ ہو رہے ہیں۔ ہندوستان میں بھی معاملہ کچھ ایسا ہی تھا، اس لئے وہاں شہری علاقوں میں مکان کی حد ایک ہزار مربع گز مقرر کی گئی جو پونے ۲ کنال کے قریب بنتی ہے۔ اس بارے میں اسلامی تعلیمات تو اتنی سخت ہیں کہ مشکل سے پانچ سو مربع گز کی حد کی گنجائش نکل سکے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بارے میں عملی نمونہ پیش فرمایا وہ خود ایک سادہ سے مکان میں زندگی بسر کرتے تھے، اور صحابہ کو بھی ایسا کرنے کا حکم دیا۔ دورِ رسالت میں کالے دھن کا تو تصور بھی نہیں کیا جا سکتا، اس دور میں کوئی صحابی اپنی حلال کی کمائی سے بھی کوئی بڑا مکان بنا لیتے تھے تو آپ اس پر بھی سخت ناراضگی کا اظہار فرماتے تھے۔ امام

ابو داؤد نے حدیث کے اپنے مجموعے سنن ابوداؤد کے کتاب الاداب میں، حضرت انسؓ کی زبانی یہ حدیث روایت کی ہے:۔

"ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (شہر سے) باہر تشریف لے گئے تو راستے میں آپؐ نے ایک گنبد نما مکان دیکھا، آپؐ نے دریافت فرمایا یہ کیا ہے۔ صحابہ نے عرض کیا کہ یہ فلاں انصاری کا مکان ہے۔ اس پر آپ خاموش ہو گئے اور بات اپنے دل میں رکھی۔ تاآنکہ وہ آدمی آپؐ کے پاس آیا اور بھری مجلس میں آپ کو سلام کیا، آپ نے اسے نظر انداز کر دیا، آپؐ نے کئی بار ایسا کیا۔ یہاں تک کہ وہ شخص بھانپ گیا کہ آپؐ اس سے خفا ہیں اور مقصداً منہ پھیر رہے ہیں، اس نے صحابۂ کرام سے اپنی مصیبت بیان کی اور کہا کہ خدا کی قسم مجھے حضور صلعم خفا نظر آتے ہیں، صحابہؓ نے کہا، آپؐ باہر تشریف لے گئے تھے تو آپؐ نے تیرا قبہ نما مکان دیکھا تھا، یہ بات سُن کر وہ آدمی لوٹ آیا اور آکر اپنے گنبد نما مکان کو زمین کے برابر کر دیا۔ پھر رسول اللہ صلعم ایک دن وہاں دوبارہ تشریف لے گئے تو اس قبہ کو نہ دیکھا، دریافت فرمایا تو لوگوں نے اس کے مالک کا حال بیان کیا اس پر آپؐ نے فرمایا کہ آگاہ رہو کہ ہر عمارت اپنے مالک کے لئے وبال کا باعث ہو گی بجز اس کے جو ناگزیر ہو۔ (سنن ابوداؤد جلد چہارم صفحہ ۴۸۷)

رسول اللہ صلعم نے صحابۂ کرام کو سادہ زندگی اپنانے کی صرف تلقین ہی نہیں فرمائی تھی، بلکہ ایسی زندگی کا عملی نمونہ بھی ان کے سامنے پیش کر دیا تھا۔ اس کے باوجود اگر صحابہؓ میں سے کوئی اپنی حلال کی آمدنی کو عیش و عشرت کے مقاصد کے لئے خرچ کرتا تو آپ اس پر سخت ناراضگی کا اظہار فرماتے تھے جیسا کہ اوپر والے واقعہ میں گزر چکا ہے۔ آپؐ ایسے لوگوں کو اُمت کے بدترین افراد قرار دیتے تھے۔ امام بیہقی نے شعب الایمان میں حضرت فاطمۃ الزہرا بنت رسول کی زبانی یہ حدیث روایت کی ہے:۔

شرارُ اُمّتی وُلِدُوا فی التنعیم وغُذوا بہٖ یاکُلُونَ مِنَ الطعام اَلْوانًا وَیَلبِسُونَ مِنَ الثیاب الوانًا ویرکبُون مِنَ الدّواب الوانًا و یتشددون الکلام:

(ترجمہ) میری امت کے بدترین افراد وہ ہیں، جو نعمتوں کی گود میں پیدا ہوتے ہیں اور اس میں پروان چڑھتے ہیں، قسم قسم کے کھانے کھاتے ہیں، طرح طرح کے کپڑے پہنتے ہیں اور قسم قسم کی سواریاں استعمال کرتے ہیں اور گفتگو میں سختی کرتے ہیں۔

اس فرمانِ نبوی سے یہ حقیقت بھی سامنے آ جاتی ہے، کہ عیاشی کے لئے قیمتی کاروں کے ماڈل جو دن بدن بدلے جاتے ہیں اسلام میں انکی گنجائش بھی نہیں، اس لئے حکومت ہندوستان کی طرح اپنے ملک میں بھی ہر قسم کی کاروں کی درآمد پر پابندی عائد ہونی چاہیئے

اور کاد استعمال کرنے کی صرف ایسے لوگوں کو اجازت دی جائے، جو اس کے حقیقی ضرورتمند ہوں۔ اگر جمہوریہ چین کے ایک ارب باشندے ذاتی کاروں کے بغیر اپنے روزمرہ کے کام سرانجام دے سکتے ہیں تو ہمیں بھی اس کی عادت ڈالنی چاہیئے۔ اس سے کالے دھن کو عیاشی پر ضائع کرنے کا ایک دوسرا بڑا راستہ بھی بند ہو جائے گا۔

تیسرا اقدام ہندوستان کی طرح، خالص سونے کے زیورات پر پابندی لگانا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلامی معاشرے میں مساوات قائم کرنے کے لئے مسلمان مردوں اور عورتوں دونوں کے لئے سونے کے زیورات کا استعمال حرام قرار دے دیا تھا۔ اس کی تفصیلات، طلوعِ اسلام کے صفحات پر کئی دفعہ پیش کی جا چکی ہیں۔ تاہم آپؐ نے زیورات سے، عورت کی محبت کو سامنے رکھتے ہوئے، انہیں صرف چاندی کے زیور استعمال کرنے کی اجازت دی۔ حکومتِ ہندوستان نے تو حالات سے مجبور ہو کر خالص سونے کے زیورات پر پابندی لگائی ہے رجب کہ یہ ہمارے رسولؐ مقبول کا حکم ہے، اس لئے ان زیورات پر بھی پابندی لگا دی جائے تو کالے دھن کی ایک بہت بڑی مقدار جو ان پر ضائع ہو رہی ہے وہ رُک جائیگی۔ اور باہر آکر تعمیری کاموں پر صرف ہونے لگے گی

ان اقدامات کے بعد یہ حکم جاری کر دیا جائے کہ عوام کی صرف اس رقم کو جائز سمجھا جائیگا جو بنکوں میں جمع ہوگی، اس کے نتیجے میں لوگ اس تیزی سے مجوزہ بانڈ خریدیں گے، کہ ان کے لئے کسی قسم کا سود جو شریعت اسلامی میں حرام ہے، کا لالچ دینے کی ضرورت باقی نہ رہے گی۔ اس وقت مجوزہ بانڈوں پر جو سب سے بڑا اعتراض کیا گیا ہے وہ یہی ہے کہ کالا دھن جو حرام کی کمائی شمار ہوتا ہے کے ساتھ ایک دوسرا حرام یعنی سود ملا کر جائز بنایا گیا ہے۔ جس کی شریعت اسلامی میں کوئی گنجائش نہیں۔ مذکورہ بالا اقدام سے اس حرام مال کو جائز بنانے کے لئے کسی قسم کے سود کی لالچ دینے کی ضرورت باقی نہ رہے گی۔ وزیر خزانہ نے ملک میں جو کالے دھن کا تخمینہ لگایا ہے وہ خود بخود باہر آجائے گا، اس پر سود دینے کی بجائے، اس رقم سے وہ انکم ٹیکس بھی وصول کیا جا سکے گا جو انہوں نے پہلے چوری کیا ہے۔ انکم ٹیکس کے قواعد کے مطابق ٹیکس وصول کر کے، ان کی باقی رقم کو جائز قرار دیا جا سکتا ہے، ان پابندیوں کے بعد وہ اس رعائت کو بھی اپنے لئے کافی سمجھیں گے۔ اور ملک سے کالے دھن کا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہو جائے گا۔

حقائق و عبر

قابلِ تقلید

جام پور سے اسد عزیز صاحب رقمطراز ہیں۔

"میرا تعلق ایک کھاتے پیتے زمیندار گھرانے سے ہے جس کا ایک مخصوص مذہبی پس منظر ہے۔ ان گنت مساجد اور دو خانقاہیں ہمارے خاندان کا طرّہ امتیاز ہیں۔

ایک زمیندار گھرانے کا فرد ہونے کے ناطے میرے نام بھی اچھی خاصی اراضی میری ملکیت ہونی چاہیئے اور ایسا تھا بھی لیکن بعد از وصالِ یار یعنی بابا جی سے قرآنی رہنمائی پانے کے بعد زمین کے متعلق علامہ اقبالؒ کے اس قول کے مصداق کہ "دہ خدایا یہ زمین تیری نہیں میری نہیں"، میں نے اپنی ملکیت والی زمین ان لوگوں کے نام کر دی جو اس زمین کا سینہ چیر کر اس میں سے سونا نکالتے تھے۔

میرے اس عمل نے ظاہر ہے میرے خاندان کو شاید صدمہ پہنچایا لیکن اس قرآنی حکم کی بجا آوری سے جو خوشی اور اطمینان مجھے حاصل ہوا اس کا کوئی بدل نہیں۔ بے غرضی کا غرض بن جانا کتنا اعتماد بخش ہے؟ اس کا اندازہ مجھے اُن خستہ حال ہاتھوں کے دراز ہونے اور خشک ہونٹوں والی دعاؤں سے ہوا جنہیں میں محترم بابا جی" کی نذر کرتا ہوں۔

اور وہ بھی کہتے ہیں![ص۱]

اس وقت خود مسلمانوں میں فرقہ بندیوں اور جماعتوں کی کیا کمی ہے؟ شیعہ سنّی کے علاوہ ہمارے فقہی اختلافات کا اکھاڑہ۔ مزید برآں ذات پات کے تفرقے ہیں۔ ان پر طرّہ یہ کہ سلاسلِ تصوف کے خانوادوں کے نام سے چھبیس صوفیانہ گروہ بندیاں ہیں۔ کیا کتاب وسنّت کی یہی تعلیم ہے..... ایسی زندگی کو قرآنِ حکیم شرک قرار دے کر مسلمانوں کو مشرکین کی طرح تفرقہ فی الدین کی زندگی سے منع کرتا ہے... یہ سب جانتے اور مانتے ہیں کہ سب انسانوں کیلئے صرف ایک ہی اللہ کا پسندیدہ دین ہے۔ اور اس نے مسلمانوں کو متحد ومتفق رہنے کی تعلیم دیتے ہوئے اللہ کے دین کی تشبیہہ اسی سے دی ہے اور کہا ہے کہ تم سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رہو اور تفرقہ میں نہ پڑو مگر کیا کیا جائے ہندوستان و پاکستان کے مسلمانوں میں جماعتِ اسلامی اور تبلیغی جماعت کے نام سے جماعتیں بن گئی ہیں خدا کرے مسلمانوں کے فرقے ختم ہو جائیں اور سب مسلمان ایک اور نیک ہو جائیں۔

(بحوالہ ہفت روزہ اہلحدیث لاہور)

ص۱: طلوعِ اسلام - زبانِ خداوندی ہے....؟

خونِ ابراہیم

روزنامہ پاکستان ٹائمز لاہور کی نومئی ۱۹۸۵ء کی اشاعت میں اس عنوان پر ایک مراسلہ شائع ہوا ہے، جس کا ترجمہ قارئین کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے۔

خونِ ابراہیم (بلڈ آف ابراہام) سابق امریکی صدر جمی کارٹر کی تازہ تصنیف ہے، جو حال ہی میں امریکہ میں شائع ہوئی ہے اور عرب ملکوں میں اس پر گرما گرم بحث ہو رہی ہے۔

سابق امریکی صدر مسٹر کارٹر نے مختلف تاریخی ادوار میں، فلسطینی باشندوں کے اعداد و شمار پیش کرتے ہوئے ثابت کیا ہے کہ یہ لوگ فلسطین کے اصل مالک ہیں جنہیں ان کے جائز حقوق سے محروم کر دیا گیا ہے۔ اس لئے آئندہ مسئلہ فلسطین کا جو حال بھی پیش کیا جائے، اس میں ان بے گھر لوگوں کے حقوق کی ضمانت دی جائے۔

قارئین جانتے ہیں کہ مسٹر کارٹر ہی کیمپ ڈیوڈ معاہدے کا خالق ہے، اس معاہدے کے نتیجے میں مصر نے اسرائیل کو تسلیم کر کے، اس سے سفارتی تعلقات قائم کر لئے تھے۔ جس کے نتیجے میں عرب ممالک کے درمیان اختلاف کی خلیج، پہلے سے بھی گہری ہو گئی یہاں تک کہ وہ عرب ممالک، جو امریکہ کے روائتی دوست سمجھے جاتے تھے، وہ بھی اپنے عوام کے دباؤ کی وجہ سے، مصر سے سفارتی تعلقات ختم کرنے پر مجبور ہو گئے۔ چنانچہ اس معاہدے سے فلسطین کا مسئلہ پہلے کی نسبت زیادہ الجھ گیا۔

اب مسٹر کارٹر امریکہ کے صدر نہیں رہے، شاید یہی وجہ ہے کہ اب انہوں نے مسئلہ فلسطین کا دیانتداری سے مطالعہ کیا ہے۔ یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ امریکی عوام، اپنے سابق صدروں کا بڑا احترام کرتے ہیں، اس لئے توقع کی جاتی ہے، کہ امریکہ کے موجودہ صدر اپنے ایک سابق صدر کی دیانتدارانہ اور حقیقت پسندانہ رائے کا احترام کرتے ہوئے، اپنے حلیف اسرائیل کو مجبور کر دیں گے کہ وہ فلسطین کے اصل مالکوں کے حقوق تسلیم کرے، جنہیں اسرائیل نے، آج سے ۳۷ سال قبل، ان کے آبائی گھروں سے بے دخل کر کے، انہیں دربدر کی ٹھوکریں کھانے پر مجبور کر دیا تھا۔

یہ بھی امید کی جاتی ہے کہ امریکی حکومت آئندہ فلسطین کے اصل مالکوں کو اپنے حقوق کے لئے جد و جہد کرنے کی بناء پر دہشت پسند نہیں کہے گی۔ اس سے اسلامی ملکوں میں امریکی وقار میں اضافہ ہو گا۔

قرآن کی خدمت کے پردے میں سرمایہ داری نظام کا تحفظ

پچھلے دنوں سروس انڈسٹریز لمیٹڈ کے ایک ڈائریکٹر چوہدری نذر محمد صاحب کا مختلف اخبارات میں ایک طویل اشتہار شائع ہوا جس میں یہ اعلان کیا گیا تھا کہ ان کی کتاب احکام القرآن شائع ہوگئی ہے اور وہ انہی خطوط پر احکام الحدیث مرتب کرنا چاہتے ہیں، اشتہار میں علماء حضرات سے درخواست کی گئی تھی، کہ وہ اس سلسلے میں ان کی مدد کریں، انہیں مناسب معاوضہ دیا جائے گا۔

ایک بڑے صنعت کار کی اس خدمت قرآن کو دیکھنے کا راقم کے دل میں شوق پیدا ہوا، لیکن جب کتاب منگوا کر دیکھی، تو پہلی ہی نظر میں یہ حقیقت ابھر کر سامنے آ گئی کہ ان کی یہ کوشش قرآن مجید کی انقلابی تعلیمات کو مسخ کر کے، سرمایہ داری نظام کو تحفظ فراہم کرنے کی ایک ناکام کوشش ہے۔

اس کتاب میں، تین صد مختلف عنوانات کے تحت، قرآن مجید کی آیات کا ترجمہ پیش کیا گیا ہے، ان عنوانات میں سے صرف پچاس کا تعلق، احکام القرآن سے ہے، باقی قرآن مجید کی عام تعلیمات ہیں۔ اس لئے مناسب تو یہ تھا کہ کتاب کا نام تعلیمات القرآن ہوتا۔ احکام القرآن سے یہ دھوکا ہوتا ہے، کہ اس میں قرآنی احکامات کو جمع کر دیا گیا ہے، جب کہ عملاً ایسا نہیں کیا گیا۔

ہمارے فقہا نے قرآن مجید کی چھ صد ایسی آیات کی نشاندہی فرمائی ہے کہ جن میں احکام سے بحث کی گئی ہے، انہوں نے ان آیات سے تقریباً ڈیڑھ صد کے قریب احکاماتِ قرآنی کا استنباط کیا ہے، لیکن کتاب زیر تبصرہ میں، ان میں سے صرف پچاس احکامات کا ذکر کیا گیا ہے۔ باقی تقریباً ایک صد احکامات، ایسا معلوم ہوتا ہے، دانستہ طور پر ترک کر دیئے گئے ہیں۔ مثلاً اسلامی معاشیات کے بارے میں وہ درجنوں قرآنی احکامات کہ جن سے سرمایہ داری نظام کی جڑ کٹتی ہے، ان کا مکمل بلیک آؤٹ کر دیا گیا ہے۔ ان میں سے چند احکامات یہ ہیں۔

۱۔ قرآنی حکم ہے کہ دولت صرف سرمایہ داروں کے ہاتھوں میں گردش نہ کرتی رہے جیسا کہ آجکل ہے، ارشاد ہے کَیْ لَا یَکُوْنَ دُوْلَۃً م بَیْنَ الْاَغْنِیَآءِ (الحشر ۔۷) لیکن آج کل مسلمانوں نے عملاً اسی خلافِ قرآن سرمایہ داری نظام کو اپنا رکھا ہے۔

۲۔ قرآن مجید نے دولت جمع کرنے، جسے بحرفِ عام میں سرمایہ داری نظام کہتے ہیں کو انسانیت کے لئے ہلاکت قرار دیا ہے، ارشاد ہے:۔

وَیۡلٌ لِّکُلِّ ھُمَزَۃٍ لُّمَزَۃِۨ الَّذِیۡ جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَہٗ (الھمزہ-۱-۳)

۳۔ قرآن مجید نے مومنوں کو دولت کی بجائے، انسانیت سے محبت کرنے کا حکم دیا ہے ارشاد ہے وَیُؤۡثِرُوۡنَ عَلٰۤی اَنۡفُسِہِمۡ وَلَوۡ کَانَ بِہِمۡ خَصَاصَۃٌ (الحشر-۹) (ترجمہ)۔ وہ دوسروں کو اپنے پر ترجیح دیتے ہیں، چاہے ان کی ضرورت خاص ہی کیوں نہ ہو

۴۔ قرآن حکم دیتا ہے کہ ضرورت سے زائد دولت، دوسرے انسانوں کی ضروریات پوری کرنے پر خرچ کی جائے، ارشاد ہے۔

وَیَسۡـَٔلُوۡنَکَ مَاذَا یُنۡفِقُوۡنَ قُلِ الۡعَفۡوَ۔ (البقرہ- ۲۱۹)

۵۔ قرآن تمام زمین کو اللہ تعالیٰ کی ملکیت قرار دیتا ہے، اور یہ کہ سب انسان اس سے فائدہ اٹھانے میں برابر ہیں ارشاد ہے: وَالۡاَرۡضَ وَضَعَہَا لِلۡاَنَامِ۔ اور زمین کو ہم نے انسانوں کے فائدے کے لئے بنایا۔ اسی لئے تو رسول اللہ صلعم نے زمین کی خرید و فروخت ممنوع قرار دے دی تھی، زمین اُس زمانے میں سرمایہ داری کی بنیاد تھی اور اس حکم سے اس کی جڑ کٹ گئی۔

۶۔ سرمایہ داری نظام کو ختم کرنے کے لئے قرآن نے مسلمانوں کو قرضہ حسنہ دینے کا حکم دیا اس بارے میں قرآن مجید کی سب سے لمبی آیت نازل ہوئی ملاحظہ ہو سورۃ البقرہ آیت نمبر ۲۸۲، لیکن مصنف نے اس بلاسود بینکاری کا کہیں ذکر نہیں فرمایا۔

سرمایہ داری نظام کے خلاف، اس قسم کے مزید قرآنی احکامات بھی پیش کئے جا سکتے ہیں، لیکن اختصار کو مدنظر رکھتے ہوئے، انہی پر اکتفاء کیا جاتا ہے۔ یہ چند احکامات بھی اس حقیقت کو ثابت کرنے کے لئے کافی ہیں کہ مصنف جو ایک بہت بڑے صنعتکار ہیں، نے کسطرح ان پر پردہ ڈال کر قرآن مجید کو سرمایہ داری کے ڈوبتے ہوئے سفینے کو بچانے کے لئے استعمال کیا ہے۔

مصنف عربی زبان، جو قرآن مجید کی زبان ہے، سے قطعاً نابلد معلوم ہوا اس لئے بنی صلعم پر درود کے لئے ایسے الفاظ استعمال کرتا ہے جو عربی گرامر کے مطابق غلط ہیں، وہ درود ان الفاظ میں لکھتے ہیں:۔

صَلَّی اللہُ عَلَیۡہِ وَآلِہٖ وَسَلَّمَ

عربی زبان کا مشہور قاعدہ ہے کہ حرف جار کا عطف صرف اسم ظاہر پر ہوتا ہے۔ یعنی علیہ کی ضمیرۃ کی بجائے اگر 'محمد' کا لفظ ہوتا تو پھر تو یہ درود، عربی زبان کے مطابق ٹھیک قرار پاتا، لیکن یہاں اسم ظاہر محمد کی بجائے ضمیرۃ ' ہے۔ اس کے لئے قاعدے کے مطابق حرفِ جار دوبارہ لانا پڑتا ہے جیسے

صلی اللہُ عَلَیۡہِ وعلیٰ آلہٖ وسلّم

اس صورت میں آل سے مراد امتِ مسلمہ ہوگی۔ لیکن جس فرقے نے اس غلط درود کو رواج

دیا ہے ان کے نزدیک آل سے مراد امّت مسلمہ نہیں بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کا خاندان ہے، جو ان کے عقیدے کے مطابق، نبیؐ کے وجود کا حصّہ ہیں اس لئے انہیں علیحدہ ظاہر کرنے کے لئے حرف جار علیٰ استعمال کرنے کی ضرورت نہیں۔ اگر یہ استدلال تسلیم کر لیا جائے، تو اس کی زد ختم نبوّت کے عقیدے پر پڑتی ہے یعنی آپ کی وفات کے بعد، نبوّت کا جزو آپ کی آل میں موجود رہا اور یہی اس فرقے کا عقیدہ ہے، قرآن مجید پر کتاب لکھنے سے پہلے ضروری ہے کہ عربی زبان کا اتنا علم ہو کہ جس سے حلال وحرام میں فرق ہو سکے۔

کتاب کے شروع میں مندرجہ ذیل علماء کے نام دیئے گئے ہیں، جنہوں نے اس کتاب کی تیاری میں مدد دی۔

(۱) ڈاکٹر اسرار احمد صاحب قرآن اکیڈمی لاہور۔
(۲) ملک غلام علی صاحب منصورہ لاہور۔
(۳) میاں عبدالرشید صاحب نوائے وقت لاہور
(۴) پروفیسر محمد منوّر اقبال اکیڈمی لاہور۔
(۵) علامہ بشیر احمد بخاری لاہور

اس کے علاوہ، اس کتاب کا پیش لفظ پیر محمد کرم شاہ صاحب نے لکھا ہے اور اس پر تعریفی تبصرہ مفتی محمد حسین نعیمی صاحب نے کیا ہے، حیرت ہے کہ ان علمائے کرام میں سے کسی کو یہ احساس تک نہ ہو سکا کہ کس طرح قرآنِ مجید کو سرمایہ داری نظام کے تحفظ کے لئے استعمال کیا جا رہا ہے اور عجیب بات ہے کہ ان علمائے کرام کو تعلیمات القرآن اور احکامات القرآن کا فرق بھی معلوم نہ ہو سکا۔ اور لطف کی بات تو یہ ہے کہ اس کتاب میں جو قرآنی احکامات پیش کئے گئے، وہ ان حضرات کے مسلک کے خلاف ہیں۔ مثلاً کتاب میں مرتد کی جو سزا دی گئی ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اسے سخت عذاب دیں گے، قرآن مجید میں کسی دنیاوی سزا کا ذکر نہیں۔ جب کہ یہی حضرات مطالبہ کرتے ہیں کہ شریعت میں مرتد کی سزا قتل ہے۔ کوئی بھی صاحب احکام القرآن کے اس مجموعے کو ان کے مسلک کو غلط ثابت کرنے کے لئے پیش کر سکتا ہے۔ (صفحہ ۳۷۹)

اگر یہ حضرات کسی مصلحت کی وجہ سے، مصنّف کو دیانتدارانہ مشورہ نہیں دے سکے تو وہ اب اس کی تلافی کر سکتے ہیں، اور خود مصنّف کے دل میں اگر قرآن مجید سے ذرہ بھر محبّت ہے تو وہ فوری طور پر اس کتاب کا عنوان بدل کر اسے تعلیمات القرآن، کے نام سے فروخت کرے، خیال رہے کہ کتاب کی قیمت ڈیڑھ صد روپے ہے اور اگر ہو سکے تو ہمارے تبصرے کو بھی کتاب کے آخر میں بطور ضمیمہ شامل کر لے۔

کتاب میں مختلف عنوانات کے تحت آیات لکھنے کی بجائے، مودودی صاحب کی تفہیم القرآن سے ان کا ترجمہ پیش کیا گیا ہے۔ دوسرے الفاظ میں تفہیم القرآن کو عنوانات کی نئی ترتیب سے پیش کیا گیا ہے۔ ویسے مودودی صاحب عام مسلمانوں کو تو اس طرح اپنا ترجمہ استعمال کرنے کی اجازت نہیں دیتے، لیکن معلوم نہیں ایک بڑے صنفکادہ کو ایسا کرنے کی اجازت کیسے دے دی! اوپر جن علماء کے نام دیئے گئے ہیں، ان میں سے بعض ایسے ہیں کہ اگر ان کے سامنے مودودی صاحب کی تفہیم القرآن کا نام لیا جائے تو غصّے سے ان کا پارہ چڑھ جاتا ہے۔ لیکن جب ان کی اس کتاب کو ایک صنفکادہ کے حوالے سے پیش کیا گیا، تو وہ اس کی تعریف میں رطب اللسان نظر آتے ہیں۔

مودودی صاحب کے ترجمے اور تفسیر میں کئی بنیادی غلطیاں ہیں جو اسلامی تعلیمات کے خلاف ہیں، لیکن انہیں بھی من وعن درج کر دیا گیا ہے۔ مثلاً مودودی صاحب انسان کو خدا کا خلیفہ قرار دیتے ہیں۔ مصنّف نے بھی اسی غلطی کو دہراتے ہوئے "انسان کو خدا کا خلیفہ بنا دیا ہے۔ (ص ۹۴۲) حالانکہ قرآن مجید میں انسان کو کہیں بھی خدا کا خلیفہ نہیں کہا گیا بلکہ امت مسلمہ کے تمام علماء کا یہ متفقہ فیصلہ ہے کہ جو شخص اس قسم کا عقیدہ رکھے وہ فاسق وفاجر ہے (احکام السلطانیہ از علامہ الماوردی ص۱۵) اور امام تیمیہ نے تو اس عقیدے کو خالص شرک قرار دیا ہے۔ ملاحظہ ہو ان کا فتاویٰ الکبریٰ جلد دوم صفحہ ۵۵۳

امید ہے کہ ان تفصیلات کی روشنی میں مصنّف اس کتاب میں مناسب ردوبدل کر کے، عوام الناس کے سامنے پیش کرے گا۔

محمد ارمغان ثاقب

إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ

ہماری روزمرّہ زندگی میں جس طرح کئی کام کوئی منصوبہ بنائے بغیر، کوئی انجام سوچے بنا، محض ایک دوسرے کے دیکھا دیکھی کیئے جاتے ہیں اسی طرح ہماری زبانوں سے کئی الفاظ اور جملے ان کا اصل مفہوم سمجھے اور جانے بغیر ادا ہوتے رہتے ہیں صرف اس لئے کہ دوسرے بھی ایسا کرتے ہیں اور سوسائٹی کا رواج یہی ہے۔ اس میں ہماری اپنی زبان کے الفاظ اور فقرے بھی ہوتے ہیں اور مسلمان کہلانے کی حیثیت میں بعض قرآنی آیات کا بھی ایسا استعمال ہمارے ہاں کا بہت پرانا معمول ہے۔ انہی میں قرآن کریم کی عظیم ترین آیت اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ہے جس پر کسی قسم کا غور و فکر کئے بغیر ہم نے اسے اُس وقت دہرانے کے لئے مختص کر رکھا ہے جب کوئی شخص اس دنیوی زندگی کا ساتھ چھوڑتا ہے۔ اُدھر اُس نے آخری سانس لی اِدھر بے اختیار ہمارے منہ سے نکلا اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔
ہم میں سے اکثر تو بغیر اس کے معنی جانے بغیر ان الفاظ کو دہرا لیتے ہیں تاکہ "ثواب" سے محروم نہ رہ جائیں اور جو معنی عام طور پر لئے جاتے ہیں وہ یہ ہیں کہ "ہم اللہ کے ہیں اور اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں"۔ اب اگر ہم کشادگیٔ ذہن سے کام لے کر ان معانی پر غور کریں اور سوچیں تو دو باتیں سامنے آتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ ہم پیدا ہونے سے پہلے خدا کے پاس تھے اور مرنے کے بعد حشر کے دن ہم ایک میدان میں جمع ہوں گے۔
جہاں اللہ تعالیٰ بھی ہوں گے۔ اس طرح ہم لوٹ کر اس کی طرف چلے جائیں گے۔ اس مفہوم سے یہ واضح ہوتا ہے کہ خدا کسی ایک مقام میں محدود ہے اور تمام انسانوں کو اسی مقام کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔ جبکہ قرآن کے نزدیک اللہ تعالیٰ کو کسی خاص مقام کا پابند کرنا قطعی غلط اور باطل تصور ہے۔ وہ تو اللہ کے متعلق یہ اعلان کرتا ہے کہ هُوَ مَعَكُمْ اَيْنَمَا كُنْتُمْ۔ وہ تمہارے ساتھ ہے تم جہاں بھی ہو۔ (یعنی وہ ہر مقام پر ہے) مرنے کے بعد اگلی زندگی کی کیفیت کے متعلق ہم اس زندگی میں نہیں جان سکتے۔ قرآن کریم نے تمثیلی و نسبتی انداز میں اُخروی زندگی کا نقشہ کھینچا ہے۔ ہماری موجودہ ذہنی سطح اُخروی حقیقت کا اندازہ نہیں کر سکتی۔ لیکن قرآنی آیات سے یہ بات بالکل واضح ہے کہ مردوں کا کسی ایسے مقام کی طرف جانا جہاں خاص طور پر خدا موجود ہوگا صحیح نہیں۔ دوسری بات

مذکورہ معانی سے جو سامنے آتی ہے وہ تصوف کی پیداوار ہے ویدانت یعنی ہندوؤں
کا تصوّف یہ کہتا ہے کہ انسانی روح یعنی آتما روحِ کائنات یعنی خدا (پرماتما) کا ایک حصّہ
ہے جو اپنے کُل سے الگ ہو کر مادہ کی دلدل میں پھنس چکا ہے اور اس سے رہائی حاصل
کرنے کے لئے تناسخ کے چکروں میں سے گزر رہا ہے جو آخرِ کار اپنے کل میں جا ملے
گا۔ اپنشد کے الفاظ میں جس طرح " شام کو پرندے اپنے گھونسلوں میں واپس چلے جاتے ہیں"
وہیں سے ہمارے تصوّف میں یہ تصوّر لایا گیا اور انسانی روح کو خدا کا ایک جزو سمجھ لیا گیا
جیسا کہ مشہور شعر ہے مولانا رومی کا ؎

بشنو از نے چوں حکایت مے کند۔ از جدائیہا شکایت مے کند

یا غالب نے کہا ہے:۔

؎ عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا

إِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ سے یہی مُراد لی جاتی ہے کہ جزو کا اپنے کل کی طرف لوٹ کر اس سے جا کر مل جانا۔
اسی لئے اس نظریہ کے حاملین موت کو وصال کہتے ہیں۔ فلاں صاحب واصل بالحق ہو گئے
یا ان کا وصال ہو گیا۔ وصال کے معنی مل جانے کے ہیں۔ اور یہ اس لئے غیر قرآنی تصوّر ہے
کہ انسان اور خدا جزو اور کل کا تعلق نہیں رکھتے۔ اگر کسی کُل سے اس کا کوئی جُزو علیحدہ
ہو جائے تو وہ کل نہیں رہتا۔ ذاتِ خداوندی ایک مکمل ہستی ہے۔ اس لئے اس کے کسی
جزو کے الگ ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ راجعون کے علاوہ اِلَیْہِ یا اِلَیْنَا سے ہر
جگہ سمت مراد لینا بھی درست نہیں کیونکہ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ کا ایک مفہوم "خدا کے قانون
طبیعی کے مطابق نقل و حرکت کرنا" بھی ہے۔ مثلاً سورہ آل عمران میں ہے وَلَہٗٓ اَسْلَمَ
مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّکَرْھًا وَّاِلَیْہِ یُرْجَعُوْنَ (۳/۸۲) کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے
سب اس کے قانون کے سامنے سربسجود ہے۔ طوعًا و کرھًا۔ اور اس طرح ہر شے کا قدم
اسی مرکز کی طرف اٹھتا ہے۔ ہر شے اسی قانون کے مطابق سرگرمِ عمل ہے سورہ یٰسین میں
ہے فَسُبْحٰنَ الَّذِیْ بِیَدِہٖ مَلَکُوْتُ کُلِّ شَیْءٍ وَّاِلَیْہِ تُرْجَعُوْنَ ۔ اللہ کی ذات (انسان کے خود پیدا
کردہ غلط تصورات سے) بہت دور اور بلند ہے ہر شے کی باگ ڈور اسی کے قبضۂ اختیار
میں ہے اس لئے ہر شے اس کے مقرر کردہ قانون کے مطابق گردش کرتی ہے اس کا ہر
قدم اسی قانون کی طرف اٹھتا ہے اس سے وہ ادھر ادھر ہٹ نہیں سکتی۔ انسان بھی اس
قاعدے سے مستثنیٰ نہیں۔ اس کا ہر عمل بھی قانونِ مکافات کی زنجیروں سے بندھا ہوا
ہے۔ اس لئے اس کا ہر قدم بھی اسی کی سمت اٹھ رہا ہے۔ وَاِلَیْہِ تُرْجَعُوْنَ ۔
اللہ تعالیٰ نے خارجی کائنات کے قانونِ طبیعی کے ساتھ انسانی دنیا کے قانونِ مکافات
کو محکم اور اٹل بنایا ہے۔ اور متعدد آیاتِ بینات میں قانونِ مکافات کی تشریح و توضیح

کی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: كَلَّآ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَيَطْغٰىٓ اَنْ رَّاٰهُ اسْتَغْنٰى ۔ جب انسان اپنے آپ کو مستغنی سمجھ لیتا ہے اور خیال کرتا ہے کہ وہ کسی کی مدد کا محتاج نہیں تو پھر سرکشی پر اتر آتا ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اِنَّ اِلٰى رَبِّكَ الرُّجْعٰى وہ خدا کے قانونِ مکافات کے دائرے سے باہر جا ہی نہیں سکتا اور اس حقیقت کو وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ سورۃ انبیاء میں ہے کہ تمام نوعِ انسانی ایک ہی برادری اور ایک ہی جماعت ہے لیکن لوگوں نے اپنی اپنی مفاد پرستیوں کی بناء پر اسے الگ الگ ٹکڑوں میں بانٹ دیا ہے: وَتَقَطَّعُوْٓا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ اور اس کے بعد آیا ہے: كُلٌّ اِلَيْنَا رٰجِعُوْنَ اور اس کے ساتھ ہے: فَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا كُفْرَانَ لِسَعْيِهٖ وَاِنَّا لَهٗ كٰتِبُوْنَ ۔ یعنی جو شخص صلاحیت بخش پروگرام پر کاربند رہتا ہے اور وہ مومن بھی ہے تو اس کی کوششیں بے نتیجہ نہیں رہتیں ہم ان سب کو لکھتے رہتے ہیں اس سے كُلٌّ اِلَيْنَا رٰجِعُوْنَ کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے کہ تمام انسانوں کے اعمال کے نتائج ہمارے قانونِ مکافاتِ عمل کے مطابق مرتب ہوتے ہیں۔ (بحوالہ لغات القرآن مؤلفہ پرویز)

دوسری طرف ہم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ ہمیں اپنے عملوں کا حساب قیامت کے روز ہی دینا اس سے پہلے نہیں۔ اس غلط نگہی کے تحت کہ یہاں کوئی باز پرس کرنے والا نہیں۔ من مانے اعمال سرزد ہوتے رہتے ہیں۔ یہ تصور بھی قرآن حکیم کی تعلیم کے سراسر خلاف ہے۔ دینِ اسلام کا تو محور ہی قانونِ مکافاتِ عمل ہے اور عمل کا نتیجہ خود عمل کے اندر پوشیدہ ہوتا ہے۔ جو عمل کرنے والے کی ذات پر اثرات مرتب کرتا جاتا ہے۔ کوئی خارجی سزا ملے یا نہ ملے۔ اس طرح بعض اعمال کے نتائج اسی دنیا میں محسوس طور پر سامنے آجاتے ہیں اور بعض نتائج آخرت میں ظہور پذیر ہونگے۔ اسی حقیقت کو اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ "خدا کی طرف لوٹو گے" کہہ کر بتایا گیا ہے کہ ایسا نہ سمجھ لینا کہ مر جانے پر ہم کسی کی گرفت میں نہیں رہے۔ بلکہ مرنے کے بعد بھی تم نے خدا کے قانونِ مکافات کی طرف لوٹنا ہے اس سے تم کہیں بھاگ نہیں سکتے۔

اب اس اہم ترین آیت اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ کا صحیح مفہوم ہمارے سامنے ہونا چاہیئے تاکہ اسے اموات کے مواقع پر زبان سے دہرا لینے والے عربی الفاظ بنا کر ہم اپنی ہی جانوں پر ظلم نہ توڑتے جائیں۔ اور اللہ کی بارگاہ میں ہمارا شمار ظالمین میں نہ ہو۔ قرآن کریم میں جہاں یہ آیت آئی ہے اس سے پہلی ملحقہ آیات میں یہ بتایا گیا ہے کہ نظامِ خداوندی کے قیام و استحکام میں بڑی بڑی مشکلات کا سامنا ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ جان بھی دے دینی پڑتی ہے یہ اصول بیان کرنے کے بعد جماعتِ مومنین سے کہا گیا ہے کہ تمہارے سامنے بھی ایسے سخت مواقع آئیں گے۔ کہ تمہارا

سابقہ خوف - بھوک - اموال واسباب کا نقصان - دشمنوں کی طرف سے ایذا رسانی اور جانوں کا زیاں یہ سب باتیں برداشت کرنا ہوں گی اور پھر قرآن یہ نوید دیتا ہے کہ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِیْنَ الَّذِیْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِیْبَةٌ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ (۲/۱۵۶) تو خوشگوار نتائج کی بشارت دے دے ان لوگوں کو جن کی کیفیت یہ ہے کہ انہیں جب بھی اس قسم کے واقعات پیش آتے ہیں تو وہ دل کے پورے اطمینان سے کہہ دیتے ہیں کہ اس میں گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ ہماری ساری زندگی خدا (نظامِ خداوندی) کے لئے وقف ہے اور ہم ان مشکلات کے مقابلہ کے لئے اسی کے قانون کی طرف رجوع کرتے ہیں ہمارا ہر قدم بہرحال وبہرطور اسی منزل کی طرف اٹھے گا جو ہمارے خدا نے ہمارے لئے متعین کی ہے اور جو ہماری زندگی کا مقصود ومنتہٰی ہے - اِنَّآ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ اس کے بعد فرمانِ خداوندی ہوتا ہے اُولٰٓئِكَ عَلَیْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ یہ ہیں وہ لوگ جن پر اللہ کی طرف سے تبریک وتہنیت کے پھولوں کی بارش ہوتی ہے اور یہی لوگ ہیں جن کا قدم صحیح راستے پر اٹھ رہا ہے - اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ خود اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ کی تشریح کر رہا ہے

(بحوالہ لغات القرآن پرویز)

درحقیقت اس آیۂ جلیلہ میں مسلمانانِ عالم کو ان کے مقصودِ حیات سے آگاہ کیا گیا ہے۔ اِنَّا لِلّٰهِ کہہ کر ہم اپنے دل سے یہ عہد کر رہے ہوتے ہیں کہ ہماری ساری زندگی نظامِ خداوندی کے لئے وقف ہے اور وَاِنَّآ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ کے الفاظ جو ہماری زبان سے ادا ہوں تو اس لئے کہ ہم نے یہ سمجھ لیا ہے کہ ہماری زندگی کی تمام تگ وتاز کا رخ اسی کی طرف ہے۔ دنیا بھر کی مشکلات ومصائب کے باوجود ہمارا ہر قدم اسی نظام کی طرف اٹھتا ہے۔ اسی سے ہم توانائیاں حاصل کرتے ہیں اور اسی کی رُو سے ہمارے اعمال نتیجہ خیز ہوتے ہیں ہمارا ہر عمل اسی کے قانونِ مکافات سے بندھا ہے۔ اس دنیا میں بھی اور آخرت کی زندگی میں بھی۔

آیئے ذرا رُک کر سوچیں کہ اس قرآنی مقصودِ حیات کو ہم نے کہاں تک اپنا رکھا ہے!!

راقمہ

(ثریا عندلیب ۲۵ مئی سنہ ۱۹۸۵)

زمینداری اور جاگیرداری

(کا نظام اسلام کے خلاف ہے)

قرآن کریم کی رُو سے اگر دیکھا جائے تو یہ امر نہایت وضاحت کے ساتھ سامنے آجاتا ہے کہ اسلام میں مروّجہ زمینداری وجاگیرداری نظام کے لئے قطعًا کوئی جگہ نہیں ہے۔ اس موضوع پر بحث کرتے ہوئے ہمیں سب سے پہلے یہ دیکھنا ہوگا کہ اسلام میں انفرادی ملکیّت کا تصوّر بھی موجود ہے یا نہیں۔ اگر ہے تو اس کی حیثیت کیا ہے؟ نیز اس امر کو بھی دیکھنا ہوگا کہ اسلام انفرادی ملکیّت کو جائز رکھتا ہے تو بلا تخصیص و تحدید ہر قسم کی چیزوں میں اس کو جائز رکھتا ہے یا اس ضمن میں کچھ حدود وقیود عائد کرتا ہے — اس میں کچھ مستثنیات تو نہیں ہیں۔ قرآن کی ہدایت اس باب میں کسقدر واضح ہیں سردست ہم اس سے بحث نہیں کریں گے کیونکہ قرآن کی رُو سے اسلام کا نظامِ ربوبیت کیا ہے۔ اس موضوع پر ایک تفصیلی تصنیف محترم پرویز صاحب کے زیرِ ترتیب ہے جس سے اُس کے تمام گوشے نکھر کر سامنے آجائیں گے[1] اس فرصت میں ہمیں صرف یہ دیکھنا ہے کہ ہم سے پہلے اور حضرات اس موضوع پر کیا کچھ لکھ چکے ہیں۔ اور ان کے نتائجِ فکر اس باب میں کیا ہیں؟

اس موضوع پر ہم سب سے پہلے مصر کے مشہور علامہ سیّد قطب[2] کا خیال پیش کرتے ہیں جو انہوں نے اپنی کتاب العدالۃ الاجتماعیۃ فی الاسلام میں بیان کیا ہے۔ ان کی اس بحث کا خلاصہ حسب ذیل ہے:۔

"یہ صحیح ہے کہ اسلام نے بعض اموال میں انفرادی ملکیت کے حقوق کو تسلیم کیا ہے مگر اس کے لئے کچھ حدود اور قیود عائد کی ہیں۔ ساتھ ہی کچھ ایسے اموال بھی ہیں جن کے لئے اسلام انفرادی ملکیت کے حق کو تسلیم کرتا ہے اس کی حیثیت بھی عینی ملکیت کی ہرگز نہیں ہے بلکہ اگر ذرا گہری نظر سے دیکھا جائے تو فرد کی حیثیت ان اموال میں بھی جماعت کی طرف سے یک گونہ وکیل کی سی ہے۔ ورنہ مال علی العموم جماعت ہی کی ملکیت میں داخل ہے اور جماعت بھی دراصل حقیقی مالک نہیں ہے بلکہ وہ خدا کی طرف سے نیابتہً اس میں تصرّفات کرنے کا حق رکھتی ہے۔ ورنہ ہر چیز کا مالکِ حقیقی سوائے خدا کے اور کوئی نہیں ہے۔

---

[1] یہ کتاب شائع ہوکر بہت مقبول ہوچکی ہے [2] اب یہ مرحوم ہوچکے ہیں

قرآن کریم وضاحت کے ساتھ اس اصلِ عظیم کو واضح کر دیتا ہے چنانچہ سورۂ حدید میں ہے:-

اٰمِنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ وَاَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَکُمْ مُّسْتَخْلَفِیْنَ فِیْہِ ؕ (۵۷/۷)

اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ اور جن اموال میں اس نے تمہیں خلیفہ بنایا ہے ان کو مصالح عامہ کے لئے کھلا چھوڑ دو۔

اس آیت میں کسی تاویل کی گنجائش نہیں ہے۔ جو معنی ہم نے اس سے سمجھے ہیں۔ اس کے لئے یہ نصِ صریح ہے کہ انسان کے ہاتھ میں جو اموال ہیں اور انسان ان اموال میں وکیل ہے۔ اصیل نہیں ہے ایسے ہی سورۂ نور میں جہاں مکاتبین وہ غلام جو مکاتبت کر کے آزادی حاصل کرنا چاہیں۔ کی امداد و اعانت کا حکم دیا گیا ہے۔ وہاں حق تعالیٰ فرماتے ہیں:-

وَاٰتُوْھُمْ مِّنْ مَّالِ اللّٰہِ الَّذِیْٓ اٰتٰکُمْ ؕ (۲۴/۳۳)

اور ان مکاتبین کو خدا کے اس مال میں سے دو جو اس نے تمہیں دیا ہے۔

یہاں دیکھیئے کہ مالدار لوگ ان مکاتبین کو اپنا مال نہیں دیتے ہیں بلکہ اللہ کا مال دیتے ہیں۔ دینے والے محض درمیان کا واسطہ بنتے ہیں۔ تیسری آیت جو سورۂ نحل کی ہے وہ ان سے بھی زیادہ صریح ہے۔

وَاللّٰہُ فَضَّلَ بَعْضَکُمْ عَلٰی بَعْضٍ فِی الرِّزْقِ ۚ فَمَا الَّذِیْنَ فُضِّلُوْا بِرَآدِّیْ رِزْقِھِمْ عَلٰی مَا مَلَکَتْ اَیْمَانُھُمْ فَھُمْ فِیْہِ سَوَآءٌ ؕ اَفَبِنِعْمَۃِ اللّٰہِ یَجْحَدُوْنَ ۝ (۱۶/۷۱)

خدا نے تحصیلِ رزق کے ضمن میں بعض کو بعض سے زیادہ صلاحیتیں دی ہیں۔ جو لوگ زیادہ مال کما سکتے ہیں وہ زائد مال کو اپنے زیر دستوں کی طرف کیوں نہیں لوٹا دیتے۔ کیونکہ یہ مال انہی کا ہے۔ یہ لوگ ایسا اس خیال سے نہیں کرتے کہ اس طرح برابر ہو جائیں گے ایسا خیال کرتے ہیں وہ خدا کی نعمت سے انکار کرنا چاہتے ہیں۔

یہاں قرآن کریم نے یہ چیز ثابت کر دی ہے کہ دولت مند لوگ اپنے ہاتھ کے نیچے کے لوگوں کو جو کچھ دیتے ہیں وہ دراصل ان مالداروں کے مال کا کوئی حصہ نہیں ہوتا جو وہ ان ضرورتمندوں کو دیتے ہیں۔ ہرگز نہیں۔ بلکہ یہ دراصل خود ان کا اصلی حق ہوتا ہے جسے یہ لوگ پورا کرتے ہیں کیونکہ اس مال میں وہ اور یہ سب برابر ہیں۔ ان میں سے ہر کوئی دوسرے کے مثل حقدار ہے کیونکہ مال کا سرچشمہ ایک ہی ہے جو کچھ یہ لوگ لیتے ہیں اس میں ان کا حق ایسا ہی ہے جیسا ان لوگوں کا جو دیتے ہیں۔ اس کے بعد سوال انکاری ہے کہ کیا یہ لوگ خدا کی نعمت کا انکار کرنا چاہتے ہیں کیونکہ یہ مال جو ان کے قبضہ میں ہے درحقیقت ان کی اپنی ملکیت نہیں ہے بلکہ خدا تعالیٰ کا تفضل و انعام ہی تو ہے۔

اس سے بھی زیادہ صریح قرآن کا وہ حکم ہے جو سورۂ نساء میں موجود ہے جس سے

انفرادی ملکیت کی حقیقت بالکل ہی واضح ہو جاتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ ملکیت کہتے کسے ہیں؟ ظاہر ہے کہ اس سے مراد تصرّف اور انتفاع کی ملکیت ہی ہے۔ اگر کسی کو کسی مال میں تصرّف اور انتفاع کا حق نہیں تو وہ اس کا مالک نہیں کہا جا سکتا۔ اس کے بعد دیکھئے کہ قرآن کریم ہر فرد کو اپنے اموال میں تصرّف کا حق نہیں دیتا بلکہ اس کے لئے صلاحیتِ تصرّف کی شرط عائد کرتا ہے۔ اگر کوئی شخص تصرفات میں حماقت و سفاہت کا ثبوت بہم پہنچاتا ہے تو ولی یا جماعت اس کے حق تصرف کو واپس لے سکتی ہے۔

وَ لَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ اَمْوَالَكُمُ الَّتِىْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِيٰمًا وَّارْزُقُوْهُمْ فِيْهَا وَاكْسُوْهُمْ وَقُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ○ (۴/۵)

اور سفیہ لوگوں کو تم اپنے اموال نہ دو جنہیں خدا نے تمہارے لئے قیام کا باعث بنایا ہے بلکہ اس میں انہیں کھانے پہننے کے بقدر ہی دو۔

اس آیت میں یہ امر واضح کر دیا گیا ہے کہ تصرف کا حق انسان کو اسی وقت مل سکتا ہے جبکہ وہ ہوش و خرد کے ساتھ اس فرض کو ادا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ اگر کسی مالک میں یہ صلاحیت نہیں ہے تو ملکیت کے طبعی ثمرات یعنی حقوقِ تصرف موقوف ہو جاتے ہیں۔ اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ جس شخص کا کوئی بھی وارث نہ ہو تو امام ہی اس کا وارث ہوتا ہے یعنی وہ جماعت کا مال ہے جس پر فرد کو قبضہ حاصل تھا۔ جب اس کے بعد وہ منقطع ہو جاتا ہے تو مال اپنے اصلی سرچشمہ کی طرف لوٹ آتا ہے۔

یہ چیز واضح طور پر سمجھ لینی چاہیئے کہ فرد کے اندر یہ شعور ہی کہ وہ اس مال میں جو دراصل جماعت کی ملکیت ہے محض جماعت کی طرف سے نائب یا وکیل ہے ان فرائض کو قبول کرنے پر مجبور کر سکتا ہے جو ایک نظام اس کے ذمے عائد کرتا ہے اور ان قیود کو منوا سکتا ہے جس سے وہ اس کے تصرفات میں حد بندیاں لگاتا ہے ساتھ ہی جماعت کا یہ شعور کہ وہی اس مال کی اصلی مالک ہے، جماعت کو فرائض عائد کرنے اور حدود قائم کرنے کی جرأت دلا سکتا ہے۔ کیونکہ اسلام میں عینی ملکیت کی تو کوئی حیثیت ہی نہیں بلکہ بعض اموال میں تو درحقیقت اس کا کوئی وجود ہی نہیں ہے۔ مثال کے طور پر زمین کو لے لیجئے۔ عقل اس کا تصور بھی نہیں کر سکتی کہ کوئی انسان خود زمین کا مالک ہو سکتا ہے۔ انسان دراصل اس کی پیداوار اور غلّہ کا مالک ہوتا ہے نہ کہ خود زمین کا۔ تو اعتبار محض انتفاع کا ہے۔ نہ کہ عینی ملکیت کا۔

۱ے یہاں اَمْوَالَكُمْ کا لفظ مزید دعوتِ فکر دے رہا ہے۔ سفہا کے اموال کو قرآن ان کے اموال قرار نہیں دیتا بلکہ (اموالکم) جماعت کے اموال قرار دیتا ہے۔

اس کے بعد ایک اور بنیادی مسئلہ پر بھی غور فرمائیے کہ اسلام مال سے انتفاع کے لئے بھی اس کا روادار نہیں ہے کہ وہ لوگوں کے ایک خاص گروہ میں قید ہو کر رہ جائے کہ ہر پھر کر انہیں میں گھومتا رہے اور دوسرے لوگ اس کو نہ پا سکیں۔ سورۃ حشر کی اس آیت پر غور فرمائیے۔

كَيْ لَا يَكُونَ دُولَةً بَيْنَ الْأَغْنِيَاءِ مِنكُمْ (۵۹/۷)

تاکہ مال تم میں سے صرف دولتمندوں کے درمیان گردش نہ کرتا رہے۔

اس نص کے ساتھ ایک واقعہ متعلق ہے جسے سمجھ لینے سے آیت کو سمجھ لینے میں ہمیں سہولت ہوگی۔

آپ کو معلوم ہے کہ مکہ مکرمہ سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مہاجرین نے مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کی، جو تنگدست تھے وہ اپنے ساتھ کیا مال لے کر آتے لیکن جو دولتمند تھے وہ بھی اپنا مال ساتھ نہیں لا سکے۔ لہٰذا دوسرے "تنگدستوں کی طرح یہ بھی "تنگدست ہی تھے۔ انصار نے انتہائی سخاوت کا مظاہرہ کیا اور اس بخل سے اپنے آپ کو بلند کر کے دکھا دیا جو انسانی نفس میں پوشیدہ ہے انہوں نے ان مہاجرین کے ساتھ برادرانہ تعلقات قائم کئے اور ہر اس چیز میں جو ان کی ملکیت میں تھی ان کو برابر کا شریک کر لیا، حتیٰ کہ محبوب ترین اشیاء تک بھی۔ یہ سب کچھ انہوں نے کسی جبر و اکراہ سے نہیں بلکہ نہایت خوشدلی اور فراخ حوصلگی کے ساتھ کیا۔ سورۃ حشر میں ہے:-

يُحِبُّونَ مَنْ هَاجَرَ إِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُونَ فِي صُدُورِهِمْ حَاجَةً مِّمَّا أُوتُوا وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ (۵۹/۹)

جو لوگ ان کی طرف ہجرت کر کے آئے ہیں انصار ان سے محبت کرتے ہیں اور جو اموال ان کو دیئے گئے ہیں ان کو مہاجرین کے حوالہ کر دینے سے اپنے سینوں میں "تنگی محسوس نہیں کرتے بلکہ اپنی ضرورتوں پر ان کی ضرورتوں کو ترجیح دیتے ہیں اگرچہ درحقیقت وہ خود ان چیزوں کے انتہائی محتاج ہیں۔

صحیح اعتقاد انسان کو کیا سے کیا بنا دیتا ہے حضرات انصار رضی اللہ عنہم اجمعین اس کا کامیاب نمونہ تھے۔

مگر مدینہ منورہ کے مالداروں اور فقراء مہاجرین میں پھر بھی عدم توازن کی ایک خلیج حائل تھی۔ نبی صلعم انصار کی سخاوت اور دریا دلی کو دیکھ رہے تھے لہٰذا آپ اس کی ضرورت محسوس نہیں کرتے تھے کہ جو کچھ وہ خود ہی کر رہے ہیں اس سے زیادہ کا ان سے مطالبہ کریں۔ تا آنکہ واقعہ بنی نضیر پیش آیا جس میں جنگ نہیں ہوئی تو اس کا تمام فئے، اللہ اور رسول (مرکزِ ملت) کی ملکیت قرار پایا۔ اس وقت حضورؐ کی رائے ہوئی کہ مسلمانوں

کی جماعت میں مالی اعتبار سے کسی قدر توازن قائم کر دیں چنانچہ بنی نضیر کا تمام فئے خصوصیت کے ساتھ مہاجرین ہی کو عطا کیا گیا۔ انصار میں سے فقط دو آدمی تھے جنہیں اس میں حصہ دیا گیا تھا کیونکہ وہ دونوں واقعی ضرورتمند تھے۔ اس واقعہ کے بارے میں قرآن کریم کہتا ہے:

مَآ اَفَآءَ اللّٰہُ عَلٰی رَسُوْلِہٖ مِنْ اَھْلِ الْقُرٰی فَلِلّٰہِ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰکِیْنِ وَابْنِ السَّبِیْلِ ۙ کَیْ لَا یَکُوْنَ دُوْلَۃً ۢ بَیْنَ الْاَغْنِیَآءِ مِنْکُمْ ؕ وَمَآ اٰتٰکُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْہُ ۚ وَمَا نَھٰکُمْ عَنْہُ فَانْتَھُوْا ۚ وَاتَّقُوا اللّٰہَ ؕ اِنَّ اللّٰہَ شَدِیْدُ الْعِقَابِ ۘ لِلْفُقَرَآءِ الْمُھٰجِرِیْنَ الَّذِیْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِھِمْ وَاَمْوَالِھِمْ یَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰہِ وَرِضْوَانًا وَّیَنْصُرُوْنَ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ ؕ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الصّٰدِقُوْنَ ۚ (۵۹/۷-۸)

مختلف آبادیوں سے جو اموال بطور فئے کے حاصل ہوں وہ صرف اللہ اور رسول (مرکز ملت) اور قرابت داروں، یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کے لئے ہیں۔ یہ حکم اس لئے ہے تاکہ دولت تمہارے مالداروں ہی کے درمیان گردش نہ کرتی رہے (بلکہ معاشرہ میں مالی توازن قائم رہے) لہذا رسول جو کچھ تمہیں دے وہ لے لو، جو نہ دے اس سے باز رہو اور تقویٰ شعار بنو (یاد رکھو) خدا کا عذاب (نافرمانوں کے لئے) بڑا ہی سخت ہے۔ یہ اموال فئے صرف ان ضرورتمند مہاجرین کے لئے ہیں جن کو اپنے شہروں اور اموال و دولت سے بے دخل کرکے نکال دیا گیا ہے وہ خدا کے فضل و رضا کے طالب اور خدا کے دین اور رسول کے (مشن کے) مددگار رہیں۔ یہی لوگ (اپنے دعوائے ایمان میں) سچے ہیں۔

رسول اللہ صلعم کا اموال بنی نضیر میں یہ تصرف کہ انہیں صرف مہاجرین ہی میں تقسیم کرنا قرآن کی طرف سے اس تصرف کی تصدیق و تائید اور پھر اس کی علت بیان کرنا کہ ایسا اس لئے ہے تاکہ دولت صرف چند دولتمندوں ہی میں سمٹ کر نہ رہ جائے کہ صرف ان کے درمیان ہی گردش کرتی رہے۔ مسئلہ کی حقیقت کو بالکل واضح کر دیتا ہے جس کے مزید بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہاں سے صراحتاً یہ اصول مستنبط ہو جاتا ہے کہ اسلام بنیادی طور پر اس کے خلاف ہے کہ دولت جماعت کے اندر چند ہاتھوں میں محبوس ہو کر رہ جائے اس کے برعکس اسلام کا منشاء یہ ہے کہ جماعت کے مختلف اوضاع میں ایک قسم کا ایسا اعتدال پیدا کر دے کہ ملت میں مکمل توازن قائم رہے اور دولت صرف دولت مند لوگوں ہی میں گردش نہ کرتی رہے کیونکہ ایک جہت میں مال و دولت کے انبار جمع ہو جاتا اور دوسری جہت سے بالکل سمٹ جانا بہت بڑے اجتماعی مفاسد کا باعث بن جاتا ہے جس سے جماعت کے مختلف طبقات میں حسد، کینہ، اور بغض و عناد کے جذبات پیدا ہو جایا کرتے ہیں۔

اس کے علاوہ کچھ ایسے اموال بھی ہیں جن سے مفاد عام والبتہ ہوتا ہے اور افراد کے لئے ان کو کسی جہت سے بھی اپنے لئے مخصوص کر لینا جائز نہیں ہے چنانچہ رسول اللہ صلعم نے اس قسم کی تین چیزوں کی تصریح فرما دی ہے۔یعنی پانی۔چارہ اور آگ۔

الناس شرکاء فی ثلث، الماء، والکلا والنار

تمام لوگ تین چیزوں میں شریک ہیں۔ پانی۔چارہ اور آگ۔

چونکہ عرب کے قدیم تمدن میں یہ تین چیزیں حیاتِ اجتماعی کی ضروریات میں شمار ہوتی تھیں لہٰذا ان تین چیزوں سے انتفاع حاصل کرنا پوری جماعت کا حق شمار کیا گیا ہے مگر ظاہر ہے کہ اجتماعی حیات کی ضروریات نہ ہر تمدن میں یکساں ہوسکتی ہیں، نہ ہر زمانہ میں۔قیاس، جو تشریع اسلامی کے اصولوں میں سے ایک اہم اصول ہے اس کی گنجائش رکھتا ہے کہ جو چیزیں بھی اس حکم میں داخل ہوں وہ تطبیق کے وقت اس میں شامل کر لی جائیں۔

لہٰذا اسلام میں انفرادی ملکیت کی طبعی حقیقت کا خلاصہ یہ قانون ٹھہرا کہ مال عموماً جماعت کی ملکیت ہے اور انفرادی قبضہ مالکانہ نہیں بلکہ محض وکالتہً ہے جس کے لئے بہت سی شرطیں اور قیود ہیں۔نیز بعض اموال کا شمار اموال عامہ میں ہوگا جن پر کسی شخص کی انفرادی تحویل بھی صحیح نہیں ہوسکتی۔ساتھ ہی یہ بھی کہ ان انفرادی تحویلوں کا بھی ایک حصہ ایسا ہے جو جماعت کا حق ہے اور جماعت اس حصہ کو افراد سے واپس لے کر ان طبقات پر خرچ کر دیتی ہے جنہیں اس کی ضرورت ہو تاکہ وہ اپنی حالت کو درست کر سکیں اور ان کی حالت کی درستگی سے جماعت کی مجموعی حالت درست ہو سکے۔"

(یہ ہے خلاصہ علامہ قطب کی بحث کا)

مذکورہ بالا بحث سے جو نتائج ہمارے سامنے آتے ہیں انہیں ایک مرتبہ پھر دہرا لیجئے تاکہ آگے بڑھنے میں آسانی ہو۔

(۱) اسلام نے اموال پر انفرادی ملکیت کے حق کو عینی ملکیت کی حیثیت سے تسلیم نہیں کیا۔

(۲) جو اموال انفرادی تحویل میں ہوں ان پر افراد وکالتی حیثیت سے تصرف کا حق رکھتے ہیں ورنہ وہ سب جماعت کی ملکیت ہوتے ہیں۔

(۳) اموال کی دو قسمیں ہیں۔

(ا) جن پر وکالتی تحویل کا حق تسلیم کیا جاسکتا ہے۔

(ب) جن پر یہ حق بھی تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔

(۴) جو اموال ایسے ہوں کہ ان سے مفادِ عام والبتہ ہو ان پر انفرادی تحویل کا حق تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔اب سے چودہ سو سال پہلے عرب کے قدیم تمدن میں حضور اکرم صلعم نے

اس ضمن میں تین چیزیں (پانی ۔ چارہ ۔ آگ) کی تعیین وتخصیص فرما دی تھی ۔

(۵) اجتماعی حیات کی ضروریات تمام تمدنوں اور تمام زمانوں میں یکساں نہیں ہو سکتیں ۔ ان تین چیزوں پہ انفرادی تحویل کا حق تسلیم نہ کرنے کی علت چونکہ ان سے مفادِ عام کا وابستہ ہونا ہے لہٰذا قیاس کو کام میں لاتے ہوئے اگر کسی دوسرے تمدن یا کسی دوسرے زمانے میں کچھ اور چیزیں ایسی ہوں جن سے جماعت عام کا مفاد وابستہ ہو تو ان کو بھی قیاساً اسی ذیل میں شامل کیا جائے گا ۔

اس تمہید کے بعد آیئے ہم دیکھیں کہ زمین کے متعلق عہدِ رسالت مآب اور خلافت راشدہ میں کیفیت کیا تھی ۔

عہدِ رسالت و خلفائے راشدین میں زمین کی حیثیت

جیسا کہ معلوم ہے اسلامی نظام کی پہلی تجربہ گاہ سرزمین عرب تھی ۔ اگر ہم اس کو اور مختصر کرنا چاہیں تو یوں کہہ سکتے ہیں کہ مدینہ منورہ کی سرزمین تھی ۔ آپ کو معلوم ہے کہ عرب کی سرزمین زیادہ تر سنگلاخوں اور ریگستانوں پر مشتمل ہے ۔ پانی کی قلت بلکہ میلوں تک نایابی کی بناء پر سرسبزی کہیں دیکھنے کو بھی نصیب نہیں ہوتی ۔ پورے جزیرۃ عرب میں طائف کا ایک حصہ ایسا ہے جسے سرسبز کہا جا سکتا ہے ۔ مدینہ منورہ میں کھجوروں کے کچھ باغات اور کہیں کہیں جو کے چند کھیت نظر آ سکتے تھے ۔ باغات اور کھیت کے لفظ سے آپ اپنے ذہن میں اپنے ہاں کے باغات اور کھیتوں کا تصور نہ لے آئیں ۔ مدینہ منورہ کے باغات ایسے ہی تھے کہ کہیں کہیں کھجوروں کے چند درخت لگا دیئے گئے اور اس کو باغ کہہ دیا گیا ۔ مدینہ منورہ کی یہ سرزمین آج بھی زائرین کے لئے وجہ شادابیٔ قلب و نگاہ ہے اس کی زرعی حیثیت ایسی نہیں ہے جس کا آج اندازہ نہ کیا جا سکے ۔ یا جو حیثیت اس کو عہدِ رسالت میں حاصل تھی وہ آج بدل گئی ہو ۔ مدینہ منورہ کے دو طرف کالے پتھروں کا وسیع و عریض سنگستان ہے جو حرہ کہلاتا ہے ۔ یہ تمام علاقہ زراعت کے ناقابل اور بنجر ہے ۔ باقی حصہ ایسا ہے کہ اس میں درخت وغیرہ لگائے جا سکتے ہیں مگر یہ حصہ بھی مسلسل ایسا نہیں ہے کہیں کہیں قابلِ زراعت ٹکڑے آ جاتے ہیں ۔ بہرحال یہ وہ سرزمین تھی جسے اسلامی نظام کی اوّلین تجربہ گاہ بننے کا شرف حاصل ہوا تھا اس زمین کا تصور اپنے ذہن میں رکھیئے اور سوچیئے کہ کیا اس علاقہ اور اس سرزمین کو مثال بنا کر اپنے موجودہ عہد کے جاگیردارانہ اور زمیندارانہ نظام کے لئے وجہ جواز نکالی جا سکتی ہے ؟ ہمارا خیال ہے کہ اس امر کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا ۔ جن لوگوں کے پاس یہ زمینیں تھیں وہ بمشکل خود ان کی ضرورتوں کو پورا کر سکتی تھیں ۔ یہ لوگ خود ہی اپنے ہاتھوں سے ان میں کام بھی کرتے تھے ۔ زمین کے مالک بن کر کام کیے بغیر زمین سے استفادہ کا طریقہ ان میں عموماً مروّج نہیں تھا

یہی وجہ ہے کہ اہل مدینہ کو کھیتی باڑی کرنے والے کسان، کاشتکار وغیرہ کے الفاظ سے یاد کیا جاتا تھا۔ قریش مکہ جو خود کو ایک تاجر قوم کے افراد سمجھتے تھے۔ مدینہ والوں کو اپنا ہمسر نہیں سمجھتے تھے۔ عام لڑائیوں میں مبازرت کے وقت قریشی بہادروں نے انصار مدینہ سے دو دو ہاتھ کرنا بھی گوارہ نہیں کیا اور جواب میں یہی کہا کہ ہم کسانوں سے مقابلہ کرنے میں اپنی کسر شان سمجھتے ہیں ابوجہل کو مرتے دم اگر افسوس تھا تو یہی کہ وہ کسانوں کے لونڈوں کے ہاتھ سے مارا گیا۔ چنانچہ اہل مدینہ کے اس پیشہ کے متعلق صحاح ستہ میں ابوہریرہؓ کا یہ قول موجود ہے۔

کان یشغلھم عمل اراضیھم

ہمارے انصاری بھائیوں کو اپنی زمینوں پر کام کرنے سے فرصت نہیں ملتی۔

مدینہ منورہ کے دو اہم قبیلوں اوس و خزرج میں سے قبیلہ اوس کے سردار حضرت سعد بن معاذؓ کے متعلق امام سرخسیؒ نے نقل کیا ہے کہ

کھیتوں اور نخلستانوں میں کدال اور پھاوڑے سے کام کرنے کی وجہ سے ان کی ہتھیلیوں میں گٹے پڑ گئے تھے۔ (کتاب الکسب للسرخسی ضمیمہ مبسوط جلد ۳۰ صفحہ ۲۴۵)

جس قوم کے سرداروں کا یہ حال تھا ان کے عوام کا حال معلوم۔ البتہ مدینہ منورہ میں بنو حارثہ کا ایک قبیلہ ضرور ایسا موجود تھا جن کے قبضہ میں اپنی ضرورت سے زیادہ زمینیں تھیں۔ چنانچہ خود اس قبیلہ کے ایک فرد حضرت رافع بن خدیجؓ کا یہ قول بخاری میں موجود ہے

کنا اکثر الانصار مزدرعا (بخاری)

تمام انصار میں سب سے زیادہ زرعی زمینیں ہمارے پاس تھیں۔

روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس قبیلہ کے لوگ اپنی زمینوں کو بٹائی پر دینے کے بھی عادی تھے۔ بہرحال اگرچہ چھوٹے پیمانہ پر ہی سہی مگر زمینداری سسٹم ان کے اندر موجود تھا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی اطلاع ہوئی تو آپ نے اس قبیلہ کے سربرآوردہ لوگوں کو طلب فرمایا۔ بخاری میں حضرت ظہیرؓ (رافع ابن خدیج کے چچا) کا یہ قول موجود ہے۔

رسول اللہ نے مجھے بلایا اور پوچھا کہ اپنی زرعی زمینوں کے ساتھ تم لوگ کیا کرتے ہو؟

وہاں سے واپس آکر ظہیر اور ان کے بھائی نے اپنے خاندان کے لوگوں کو جو حضورؐ کا حکم پہنچایا ہے اس کے الفاظ یہ ہیں۔ رافع بن خدیج رضؓ کہتے ہیں:

میں نے اپنے دونوں چچاؤں (ظہیر اور مہیر) سے سنا جبکہ وہ دونوں اپنے محلہ والوں سے کہہ رہے تھے کہ زمین کو کرایہ پر بندوبست کرنے کی رسول اللہ صلعم نے ممانعت فرمادی ہے۔ (صحاح ستہ)

رافع ابن خدیجؓ اپنے ماموں سے نقل کرتے ہیں۔

میرے ماموں ایک دن آئے اور کہا کہ رسول اللہ صلعم نے ایک ایسی بات سے منع فرما دیا ہے جو تم لوگوں کے لئے زیادہ نفع بخش تھی مگر اللہ اور رسول کی فرمانبرداری ہمارے اور تمہارے لئے کہیں زیادہ نفع بخش ہے۔ رسول اللہ صلعم نے تہائی اور چوتھائی پر زمینیں دینے سے بالکل منع فرما دیا ہے۔ (کنز العمال صد ۲۴۳)

شمس الائمہ سرخسیؒ نے امام محمدؒ کے حوالہ سے اسید بن حضیر صحابیؓ یہ قول بھی نقل کیا ہے۔

اے بنو حارثہ والو! آج تم پر بڑی مصیبت ٹوٹ پڑی۔ کرایہ پہ زمینوں کا بندولبست کرنے سے رسول اللہ صلعم نے ممانعت فرما دی ہے۔ (مبسوط جلد ۲۳ صفحہ ۱۲)

رافع ابن خدیج کی یہ روائتیں تمام صحاح ستہ میں مختلف الفاظ کے ساتھ موجود ہیں۔ کہیں یہ الفاظ ہیں۔

رسول اللہ صلعم نے زرعی زمینوں کو کرایہ پہ بندولبست کرنے سے منع کر دیا ہے

کہیں ان الفاظ میں ہے۔ (بخاری)

رسول اللہ صلعم نے منع فرما دیا ہے کہ زمین کو بندولبست کر کے زمین کے مقابلہ میں کوئی معاوضہ یا کسی قسم کا کوئی حصہ لیا جائے۔ (مسلم وغیرہ)

کہیں یہ تصریحات ہیں۔

رسول اللہ صلعم سے پوچھا گیا کہ کیا تھوڑا بہت اناج بھی کاشتکار سے زمین کا مالک نہیں لے سکتا؟ فرمایا نہیں، پھر سوال کیا گیا کہ اچھا غلہ نہ سہی بھوسا تو لے سکتا ہے، فرمایا نہیں۔ (نسائی)

کہیں یہ بھی تفصیلات دی گئی ہیں۔

زمین کو چوتھائی، تہائی، یا اناج کی مقررہ مقدار پہ بھی بندولبست کرنا جائز نہیں ہے۔ (ابو داؤد، مسند احمد، کنز العمال)

رہ گئی یہ صورت کہ زمین کو نقد رقم کے مقابلہ میں بندولبست کیا جائے تو اس کے متعلق رافع بن خدیجؓ رسول اللہ صلعم سے کچھ نقل نہیں کرتے۔ وہ محض اپنی رائے بیان کرتے ہیں۔ ان کی یہ رائے مختلف اوقات میں مختلف ہوتی ہے۔ کبھی وہ فرماتے ہیں:۔

دینار اور درہم کی شکل میں زمین کو کرایہ پہ لینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ (بخاری)

مگر ساتھ ہی جب ان کے پوتے عمران بن سہیل ان سے آکر عرض کرتے ہیں۔

کہ دادا جان! میں نے دو سو درہم پر اپنی زمین کرایہ پہ دیدی ہے

تو وہ ان الفاظ میں ان کو منع فرما دیتے ہیں۔

اس طریقہ کو چھوڑ دو کیونکہ رسول اللہ صلعم نے زمینوں کو کرایہ پہ دینے سے منع فرمایا ہے۔

اس اختلاف رائے کی وجہ یہ تھی کہ رسول اللہ صلعم کے زمانہ میں نقدی بندوبست کا رواج نہیں تھا۔ اس لئے صراحتہً حضورؐ سے اس کی ممانعت مروی نہیں تھی۔ لہذا وہ کبھی یہ خیال کرتے تھے کہ جس چیز سے رسول اللہ صلعم نے صراحتہً منع نہیں فرمایا اس سے ہم کیوں منع کریں اور کبھی وہ اصولی ممانعت کو سامنے رکھتے ہوئے اس سے منع فرما دیتے تھے۔ بخاری میں موجود ہے کہ رافع بن خدیجؓ سے نقدی بندوبست کے متعلق سوال کیا گیا تو انہوں نے فرمایا کہ:-

سونے چاندی پہ بندوبست کرنے کا اس زمانہ میں رواج نہیں تھا

بہرحال جہاں رافع ابن خدیجؓ سے اس کی اجازت نقل کی جاتی ہے وہ ان کا اپنا قول ہے رسول اللہ کا نہیں۔ رہی یہ بات کہ بعض روایتوں میں رافعؓ ابن خدیج نے اس اجازت کو رسول اللہ صلعم کی طرف سے بھی منسوب کیا ہے تو اس کے متعلق حافظ ابن حجرؒ نے تصریح کی ہے۔

دراصل راوی کو سمجھنے میں مغالطہ ہوا ہے ورنہ درحقیقت یہ سعید بن المسیب کا قول ہے جسے راوی نے غلط ملط کر دیا ہے کہ یہ براہ راست رسول اللہ صلعم کا حکم معلوم ہوتا ہے (فتح الباری۔ جلد ۵ صفحہ ۲۰)

رافع ابن خدیجؓ کے علاوہ اس مضمون کی حدیثیں دوسرے صحابہ سے مروی ہیں۔ چنانچہ حضرت جابر بن عبداللہؓ سے منقول ہے۔

کچھ صحابہؓ کے پاس زائد از ضرورت زمینیں تھیں۔ پس رسول اللہ صلعم نے فرمایا، جس کے پاس اپنی ضرورت سے زیادہ زمین ہو اسے وہ خود ہی کاشت کرے یا اپنے کسی بھائی کو بخش دے یا اپنی زمین کو روکے رکھے۔ (بخاری۔ مسلم)

دوسری جگہ یہ الفاظ ہیں

عطاءؒ جابرؓ سے نقل کرتے ہیں کہ لوگ تہائی چوتھائی اور نصف بٹائی پر زمینیں کاشت کے لئے دیا کرتے تھے۔ اس پر نبی صلعم نے فرمایا جس کے پاس زمین ہو اسے وہ خود کاشت کرے یا کسی کو بخش دے اور اگر وہ ایسا نہ کر سکے تو اپنی زمین کو روک رکھے۔ (بخاری۔ مسلم)

بخاری اور مسلم میں حضرت ابوہریرہؓ سے بھی اس قسم کے الفاظ منقول ہیں۔ اسی مضمون کی روایات حضرت زید بن ثابتؓ اور ثابت ابن الضحاکؓ اور ابوسعید خدریؓ سے بھی نقل کی جاتی ہیں۔ ملاحظہ ہو مسلم۔ ابوداؤد۔ طحاوی وغیرہ

یہاں تک آپ نے دیکھ لیا کہ رسول اللہ صلعم کے زمانہ میں صورت حال کیا تھی۔ زمین ہے ہی اس لئے کہ اس سے انسان اپنی غذا پیدا کریں۔ غذا پیدا کرنے کیلئے

یہ زمینیں لامحالہ کسی نہ کسی کی تحویل میں ضرور دی جائیں گی۔ ورنہ وہ خود بڑی بڑی غذا اگلنے سے رہیں۔ چنانچہ آپ مدینہ منورہ میں تشریف لائے تو جن لوگوں کے قبضہ میں زمینیں چلی آرہی تھیں آپ نے ان کو انہی کی تحویل میں رہنے دیا۔ کیونکہ عام طور سے لوگوں کے پاس اپنی ذاتی ضرورتوں سے زیادہ زمینیں نہیں ہوتی تھیں اور جن لوگوں کے پاس زمینیں ہوتی تھیں وہ اپنے ہاتھوں سے اس میں کام کاج کرتے تھے۔ مدینہ منورہ میں صرف بنو حارثہ کا ایک قبیلہ ایسا تھا جن کے قبضہ میں اپنی ضرورت سے زیادہ کچھ زمینیں تھیں اور وہ بٹائی پر لوگوں کو زمینیں دیا کرتے تھے۔ رسول اللہ صلعم کو معلوم ہوتا ہے تو آپ اس کو فوراً بند کرا دیتے ہیں۔ بٹائی پر دینے سے بھی اور کسی دوسری صورت میں کرایہ پر دینے سے بھی۔ نقد بند وبست کا اس زمانہ میں رواج موجود نہیں تھا لہٰذا اس کی ممانعت صراحتہً آپ سے نقل نہیں کی گئی۔ لیکن نھی عن کراء الارض نھی عن المزارعۃ وغیرہ عمومی ارشادات اس صورت کا حکم بھی صاف طور پر معلوم ہو سکتا ہے۔ زمین کو غلہ کی مقدار پر کاشت کے لئے دیا جائے یا روپیہ پیسہ پر، روح دونوں جگہ ایک ہی ہے لہٰذا حکم میں کوئی فرق نہیں ہو سکتا۔ رافع بن خدیج رض نقد بند وبست کے متعلق حضور ؐ کی ممانعت کی نفی کرتے ہیں جس کی وجہ وہ خود ہی بتا دیتے ہیں کہ آپ کے زمانہ میں اس کا رواج ہی نہیں تھا لیکن جب عملی طور پر خود ان کا پوتا ایسا کرنا چاہتا ہے تو وہ اس کو اس سے روک دیتے ہیں۔ اور استدلال میں حضور ؐ وہی عمومی حکم نقل فرماتے ہیں۔

یہ تھا نقشہ حضور ؐ کی زندگی میں مدینہ منورہ کی زمینوں کا جس سے جاگیردارانہ اور زمیندارانہ نظام کی بو بھی نہیں آتی۔

بے محل نہ ہوگا اگر اسی سلسلہ میں واقعۂ خیبر کا تذکرہ بھی کر دیا جائے جو بہت سی غلط فہمیوں کا موجب بنا اور آج تک بنا چلا آرہا ہے۔ چنانچہ اس واقعہ کا تذکرہ امیر جماعتِ اسلامی سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب (مرحوم) ان الفاظ میں فرماتے ہیں۔

(۲) ابن عمر رض ہی کی روایت ہے اور عبداللہ بن عباس رض اور انس بن مالک رض کی روایات اس کی تصدیق کرتی ہیں کہ نبی صلعم نے خیبر پر حملہ کیا اس کا کچھ حصہ صلحاً فتح ہوا اور کچھ بزور شمشیر مغلوب ہوا۔ آنحضرت نے آدھے علاقہ کو ۱۸ قطعات میں تقسیم کر کے ان مجاہدین پر بانٹ دیا جو غزوۂ خیبر میں شریک تھے (یعنی بحساب ۱۰۰ آدمی فی قطعہ) پھر آپ نے ارادہ فرمایا کہ معاہدہ کے مطابق یہودیوں کو وہاں سے نکال دیں۔ مگر یہودیوں نے آکر عرض کیا کہ آپ

ہمیں یہاں رہنے دیں۔ ہم آپ کی طرف سے یہاں کاشت کریں گے، آدھی پیداوار آپ لے لیجئے گا اور آدھی ہم لے لیں گے۔ آنحضرت نے یہ دیکھ کر کہ آپ کے پاس کام کرنے والے آدمیوں کی کمی ہے، ان کی بات مان لی اور ان سے فرمایا کہ ہم جب تک چاہیں گے تم کو رکھیں گے اور جب چاہیں گے تمہیں یہاں سے نکال دیں گے۔ چنانچہ ان شرائط پر آپؐ نے ان سے معاملہ طے کر لیا۔ وہ کاشتکاروں کی حیثیت سے خیبر میں کام کرتے تھے۔ آدھی زمین کی مالک حکومت تھی اور بقیہ نصف کے مالک وہ ۱۵ سو حصہ دار تھے جن پر ۱۸ قطعات تقسیم کیے گئے تھے۔ بٹائی کے معاہدہ کی رُو سے جو نصف پیداوار وہاں سے آتی تھی اس کو حکومت اور حصہ داروں کے درمیان تقسیم کر دیا جاتا تھا۔ نبی صلعم کا اپنا حصّہ بھی عام حصّہ داروں کے ساتھ تھا۔ چنانچہ آپ اس میں سے ہر سال ایک خاص مقدار میں غلّہ اور کھجوریں اپنی ازواج مطہرات کو برابر برابر دیا کرتے تھے۔ یہ بندوبست حضورؐ کے آخر حیات تک جاری رہا۔ اس پر حضرت ابوبکرؓ نے اپنے زمانۂ خلافت میں عمل کیا۔ اسی پر حضرت عمرؓ اپنے ابتدائی زمانہ میں کاربند رہے۔ پھر جب یہودیوں نے خیبر میں پیہم شرارتیں کیں اور حضرت عمرؓ کی رائے یہ ہوئی کہ معاہدے کے مطابق ان کو وہاں سے نکال دیا جائے تو آپ نے اعلان کیا کہ خیبر میں جس جس کا حصّہ ہے وہ جا کر اپنی اپنی زمین سنبھال لے۔ ازواج مطہرات کے سامنے حضرت عمرؓ نے یہ تجویز پیش کی کہ آپ میں سے جو جو پسند کریں وہ اتنی زمین لے لیں جس کی پیداوار اسی قدر ہو جس قدر غلّہ اور ثمرہ آپ کو نبی صلعم کے زمانہ سے ملتا آرہا ہے اور جو چاہیں اپنے حصّہ کی زمین حکومت کے انتظام میں رہنے دیں اور اتنا ہی غلہ اور ثمرہ حکومت سے لیتی رہیں۔ اس تجویز کے مطابق بعض ازواج مطہرات نے غلّہ اور ثمرہ پسند کیا اور حضرت عائشہؓ اور حفصہؓ رضی اللہ عنہما نے زمین لے لی۔ اس کے بعد حضرت عمرؓ نے یہودیوں کو خیبر سے منتقل کر کے تیماء اور اریحا میں بسا دیا۔ (بخاری، مسلم، احمد، ترمذی، ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ)

یہ عہد نبوت و خلافت کے مشہور ترین واقعات میں سے ہے اور اس کی صحت میں کسی شک کی گنجائش نہیں ہے۔ اس میں صریح طور پر دیکھا جا سکتا ہے کہ نبی صلعم نے خود بٹائی پر زمین کاشت کے لئے دی ہے اپنی طرف سے بھی حکومت کی طرف سے بھی اور ان پندرہ سو افراد کی طرف

سے جن کا حصہ خیبر میں تھا۔ اسی طریقہ پر آپ اپنے آخری لمحۂ حیات تک عامل رہے اور آپ کے بعد شیخین کا عمل بھی اسی پر رہا۔ کیا اس کے بعد بھی کسی کو یہ گمان ہو سکتا ہے کہ اسلامی قانون میں بٹائی پر زمین کاشت کے لئے دینا ممنوع تھا

(مسئلۂ ملکیت زمین)

امیرِ جماعتِ اسلامی کی اس جسارت پر ہم کیا کہیں؟ انہیں شاید معلوم ہو کہ یہی واقعۂ خیبر ہے جس سے لفظ مخابرہ بنایا گیا ہے۔ مخابرہ کے معنی ہوتے ہیں خیبر جیسا معاملہ کرنا۔ اس سے پہلے خود مودودی صاحب صحاحِ ستہ کے حوالوں سے حضرت زید بن ثابت رضؓ۔ جابر ابن عبداللہ رضؓ۔ رافع بن خدیج رضؓ کی روایتوں سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشادِ مبارک نقل کر چکے ہیں کہ "نهى رسول الله صلعم عن المخابرة" جس کا ترجمہ ہوا۔ "رسول اللہ صلعم نے خیبر جیسا معاملہ کرنے سے منع فرمایا ہے" ——— یہ روایات متعدد صحیح سندوں سے متعدد صحابہ سے خود صحیحین تک میں موجود ہیں۔ ان روایات میں مخابرہ کا لفظ خود بتلا رہا ہے کہ خیبر کا یہ واقعہ اس سے بہت پہلے ہو چکا تھا (اور اس معاملہ ہی کے پیشِ نظر عربی زبان اسی واقعہ سے ایک لفظ بھی وضع کیا جا چکا تھا جو عام طور سے مستعمل تھا) اس لفظ کے ساتھ ہی یہ لفظ بھی بتا رہا ہے کہ خیبر کے معاملہ کی حیثیت کچھ اور تھی۔ وہ بٹائی پر بندوبست کرنا نہیں تھا ورنہ مخابرہ کے اس نئے لفظ کو استعمال کرنے کی کوئی ضرورت ہی نہیں تھی۔ جبکہ عربی زبان میں محاقلہ۔ مزارعہ جیسے دوسرے بہت سے الفاظ پہلے سے موجود تھے۔

آنحضرت صلعم نے کھجوروں اور زمین کی پیداوار کے نصف کی جو شرط عائد کی تھی وہ جزیہ کے طور پر تھی اور اس کی دلیل یہ ہے کہ تاریخ میں یہ کہیں موجود نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہود سے اس کے علاوہ کوئی جزیہ لیا ہو یہاں تک کہ آپؐ اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ اور ابو بکر رضؓ اور عمر رضؓ نے بھی نہیں لیا۔ حتیٰ کہ حضرت عمرؓ نے ان کو جلا وطن کر دیا۔ اگر یہ جزیہ نہ ہوتا تو آیت جزیہ کے نزول کے بعد ان سے جزیہ ضرور لیا جاتا۔

(بحوالہ عینی شرح بخاری صفحہ ۲۴۷)

آپ اس نکتہ کو پھر سمجھ لیجئے کہ مودودی صاحب کا دعویٰ یہ ہے کہ جنگِ خیبر کے بعد یہودیوں کی زمین مسلمانوں کی ملکیت میں آگئی تھی اور انہوں نے (مسلمانوں نے) اسے یہودی کاشتکاروں کو بٹائی پر دے دیا تھا اس سے وہ زمین کو بٹائی پر دینے کی سند پیش کرتے ہیں۔ لیکن (جیسا کہ اوپر بتایا جا چکا ہے) اس زمین کو مسلمانوں نے اپنی ملکیت میں نہیں لیا تھا۔ وہ یہودیوں ہی کی ملکیت میں رہی تھی۔ اسلامی حکومت نے ان سے ذمی ٹیکس (نقدی کی بجائے) پیداوار کی شکل میں وصول کیا تھا۔ یہ بات

(کہ زمین یہودیوں کی ملکیت میں رہی تھی) خود مودودی صاحب کو بھی تسلیم ہے۔ چنانچہ وہ اپنی کتاب الجہاد فی الاسلام میں لکھتے ہیں :۔

یہودیوں کے اخراج کا فیصلہ ہو گیا۔ لیکن ان مجرموں کو جلا وطن نہ کیا گیا کہ ان کے اموال و اراضی پر قبضہ کر کے انہیں بیک بینی و دوگوش نکال دیا گیا ہو۔ جو کچھ وہ چھوڑ گئے اس کا پورا پورا معاوضہ بیت المال سے دیا گیا۔ (طبع دوم صفحہ ۲۶۳)

اس سے واضح ہے کہ جنگ خیبر کے بعد یہودیوں کی زمین ان کی ملکیت میں ہی رہی تھی اس لئے جب حضرت عمرؓ کے زمانے میں انہیں خیبر سے نکالنا پڑا تو انہیں اس زمین کی قیمت ادا کی گئی۔ چنانچہ مشہور مصری مصنف محمد حسین ہیکل، اپنی کتاب عمرِ فاروق میں لکھتے ہیں کہ:۔

یہی کچھ ان یہودیوں کے ساتھ کیا گیا جو خیبر اور فدک میں باقی رہ گئے تھے۔ انہیں وہاں سے جلا وطن کر کے شام بھیج دیا گیا۔ ان کی زمینوں کی قیمت انہیں دے دی گئی اور ان میں سے کسی کے ساتھ بدسلوکی نہیں کی گئی۔ (صفحہ ۵۷۸)

یہ حقائق اس کی شہادت دیتے ہیں کہ جنگ خیبر کے بعد، یہودی اپنی زمین کے بدستور مالک رہنے دیئے گئے تھے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ جب وہ اپنی زمین کے مالک تھے تو ان سے بٹائی کا معاملہ کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بٹائی کا معاملہ مزارع مالک زمین سے کرتا ہے۔

یہاں تک کی تفصیلات سے آپ نے دیکھ لیا کہ رسول اللہ صلعم کے عہدِ مبارک میں لوگوں کے پاس دو قسم کی زمینیں تھیں :۔

(۱) وہ زمینیں جو اسلام لانے سے پہلے لوگوں کے قبضہ میں چلی آ رہی تھیں۔

(۲) جو بعد میں ضرورت کے لحاظ سے مرکزِ ملت کی طرف سے ضرورت مند مسلمانوں کو عطا ہوئیں۔

(۳) پہلی قسم کی زمینیں زیادہ تر اتنی ہی تھیں جو بمشکل اپنے قابض لوگوں کی ضروریات کو کافی ہو سکتی تھیں۔

(۴) صرف بنو حارثہ کے پاس ضرورت سے زیادہ زمینیں موجود تھیں اور وہ اپنی زمینیں بٹائی پر دینے کے عادی تھے۔

(۵) بٹائی پر دینے کے سسٹم کو رسول اللہ صلعم نے قطعاً بند فرما دیا اور حکم دیا کہ جس کے پاس فاضل زمینیں ہوں وہ اپنے دوسرے بھائیوں کو بخش دیں۔

(۶) حضرات صحابہ کی اطاعت و فرمانبرداری کو دیکھتے ہوئے یہ شبہ نہیں کیا جا سکتا کہ صحابہؓ نے اس پر عمل نہیں فرمایا ہوگا اس لئے ایسا یقین کر لینے میں کوئی مانع نہیں ہے کہ ضرورت سے زیادہ زمینیں ضرورت مندوں کو فوراً دے دی گئی ہوں گی۔

(۷) جن لوگوں کے پاس زمینیں تھیں وہ خود ہی ان میں کام کرتے تھے۔

(۸) مرکزِ ملت کی طرف سے جن لوگوں کو زمینیں دی گئیں تھیں وہ بھی خود ہی ان میں کام کرتے تھے۔ ان کو بٹائی پر نہیں دے سکتے تھے۔

(۹) خیبر کی زمینیں مسلمانوں میں تقسیم کر دی گئیں تھیں اور وہ اپنی مقدار کے لحاظ سے ضرورت سے زیادہ نہ تھیں۔

(۱۰) خیبر کی زمینیں وہاں کے یہودی باشندوں کو مرکزِ ملت کی طرف سے بٹائی پر دی گئیں تھیں مگر یہ معاملہ بٹائی کا معاملہ نہیں تھا۔ بلکہ خراج یا جزیہ وغیرہ کا کوئی معاملہ تھا۔

(۱۱) چونکہ خیبر کے اس معاملہ سے شبہ ہو سکتا تھا اس لئے رسول اللہ صلعم نے صراحت کے ساتھ صحابہؓ کو خیبر جیسا معاملہ کرنے کی ممانعت فرما دی تھی۔

اب اس کے بعد آپ یہ دیکھئے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کے عہد مبارک میں جن لوگوں کے پاس یہ زمینیں تھیں ان کی حیثیت کیا تھی؟ وہ ان پر بحیثیت کاشتکار کے قابض تھے یا بحیثیت مالک کے۔ دوسرے الفاظ میں یوں سمجھئے کہ یہ زمینیں افرادِ ملت کی ملکیت متصور ہوتی تھیں یا مرکزِ ملت کی؟

اصولی طور پر ہم یہ چیز پہلے وضاحت سے بیان کر چکے ہیں کہ زمین تو زمین اسلام کسی قسم کی چیز میں بھی انفرادی ملکیت کو عینی ملکیت کی حیثیت سے تسلیم نہیں کرتا۔ وہ انتفاع اور استفادہ کے لئے افراد کی تحویل میں وکالتی حیثیت سے اموال دے دینے میں مضائقہ نہیں سمجھتا۔ مگر ملکیت بہر حال جماعت ہی کی رہتی ہے۔ زمین بھی اصولی طور پر اس سے خارج نہیں ہے لیکن خصوصی طور پر زمین کے متعلق ہمیں اس قسم کے اشارات ملتے ہیں جن سے اس خیال کی تائید ہوتی ہے کہ یہ زمینیں جو ان افراد کی تحویل میں تھیں وہ مرکزِ ملت ہی کی ملکیت متصور ہوتی تھیں نہ کہ افراد کی۔

(۱) عہدِ نبویؐ میں قابلِ کاشت زمینوں کی خرید و فروخت کی کوئی مثال نظر نہیں آتی۔

(۲) جن لوگوں کے پاس ضرورت سے زیادہ زمینیں تھیں ان کو رسول اللہ صلعم نے تین باتوں کا اختیار دیا تھا۔ رافع بن خدیجؓ کی یہ روایت پہلے گزر چکی ہے۔ جس میں رسول اللہ صلعم کا یہ ارشاد نقل کیا گیا ہے۔

جس کے پاس اپنی ضرورت سے زیادہ زمین ہو اسے وہ خود ہی کاشت کرے یا اپنے

کسی بھائی کو بخشدے۔ یا اپنی زمین کو یونہی پڑا رہنے دے۔
تیسرا اختیار تو محض تہدیدی نوعیت کا ہے اصل میں وہ دو ہی اختیار تھے یا وہ خود کاشت کریں یا اپنے کسی بھائی کو بخشدیں۔ اگر زمینوں کی بیع و فروخت بھی مشروع ہوتی تو تیسرا تہدیدی پہلو اختیار کرنے کے بجائے سیدھی بات یہ تھی کہ یوں کہا جاتا کہ وہ دوسرے کسی بھائی کو قیمتاً فروخت کردے، یہ صورت زیادہ سہل، آسان اور قابلِ قبول ہو سکتی تھی مگر اس صورت کا اختیار نہیں دیا گیا۔

(۳) عہدِ رسول اللہ صلعم میں مملکت کا قانون یہ تھا کہ جو شخص تین سال تک اپنی زمین کو بیکار و معطّل چھوڑے رکھے، حکومت اس زمین کو واپس لے لے اور کسی دوسرے آدمی کے حوالہ کردے۔ چنانچہ علامہ ابن عبید لکھتے ہیں۔
ایک صحابی کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے زمین عطا کی تھی لیکن وہ اس کو آباد نہ رکھ سکے۔ اس وجہ سے حضرت عمرؓ نے یہ زمین ان سے واپس لے لی اور حاجت مندوں میں تقسیم کر دی۔ (کتاب الاموال لابن عبید۔ صفحہ ۲۹۰)

(طلوعِ اسلام بابت اپریل ۱۹۵۳)

(بقیہ: پیامِ عید) ص ۴۶

اسی روز و شب میں اُلجھ کر نہ رہ جا | کہ تیرے زمان و مکان اور بھی ہیں

لہٰذا، قرآن کا طالبعلم نہ اپنی ذات سے مایوس ہوتا ہے نہ انسانیت کے مستقبل کی طرف سے مایوس۔ اور یہی ہے وہ نشیدِ جاں فزا جسے قرآن بار بار ہمارے قلوب تک پہنچاتا ہے اور (جیسا کہ میں نے آغازِ درس میں بتایا ہے) جسے دہرانے کے لئے، خود خدائے کائنات اس کے نزول پر جشنِ مسرت منانے کا حکم دیتا ہے جب کہتا ہے کہ قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا ط هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ (۱۰/۵۸)۔ "یہ محض اللہ کا فضل و رحمت ہے کہ تمہیں قرآن جیسی متاعِ گراں بہا مل گئی ہے۔ سو اس عطیہ کے ملنے پر جشنِ مسرت مناؤ"۔ اور یہی ہے وہ جشنِ مسرت جس میں آپ کی خدمت میں یہ کہتا ہوا ہدیۂ مبارک باد پیش کرتا ہوں کہ ؎

نہ ہو نومید، نومیدی زوالِ علم و عرفاں ہے | اُمیدِ مردِ مومن ہے خدا کے رازدانوں میں

عیدِ جشنِ نزولِ قرآن کا دوسرا نام ہے۔ اور قرآن کا پیغام یہ ہے کہ تم جب بھی میرے بتائے ہوئے راستے پر چلنے کے لئے اٹھ کھڑے ہو، تمہاری راہیں روشن ہوتی چلی جائیں گی۔ قرآن کے اس پیغام کو میں ہر سال قوم کے سامنے بطور ہدیۂ تبریکِ عید پیش کئے چلا آرہا ہوں

والسلام

نویدِ جانفزا

مطالبُ الفرقان کی جلد ششم بھی شائع ہوگئی!

اَلحَمدُ لِلّٰہ!

اس میں سورۃ الاعراف کی آیات (۱۵۹ تا ۲۰۶)، سورۃ انفال کی کُل آیات (۱ تا ۷۵)، سورۃ توبہ کی کل آیات (۱ تا ۱۲۹) سورۃ یونس کی کل آیات (۱ تا ۱۰۹) اورسورۃ ھود کی کل آیات (۱ تا ۱۲۳) آگئی ہیں، جو بیشتر مشتمل ہیں حضراتِ انبیاء سابقہ کے کوائفِ حیات اور اقوامِ گذشتہ کے نہایت عبرت خیز واقعات پر، جو احباب سلسلۂ مطالبُ الفرقان کا مطالعہ کر چکے ہیں وہ جانتے ہیں کہ تصریفِ آیات کے اصول کے مطابق جس طرح قرآنِ مجید کی تفسیر، ان مجلدات میں پیش کی جا رہی ہیں اس سے قرآنی حقائق کسطرح نکھر کر سامنے آجاتے ہیں۔

> یہ جلد اعلیٰ درجہ کے سفید کاغذ کے (۴۳۶) صفحات پر پھیلی ہوئی ہے
> کتابت، طباعت، جلد، سابقہ جلدوں کے معیار کے مطابق، عمدہ اور دلکش۔
> قیمت فی جلد -/۷۵ روپے
> محصول ڈاک۔ -/۸ روپے

ملنے کا پتہ

۱۔ ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵۔بی گلبرگ ۲ لاہور

۲۔ مکتبہ دین ودانش۔ چوک اُردو بازار۔ لاہور

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

پیامِ عید

(قرآن کی عظمت)

نہ ہو نومید، نومیدی زوالِ علم و عرفاں ہے

(پرویز صاحب کا درسِ قرآن مجید جو ۱۹۷۳ء کی تقریبِ عید پہ دیا گیا)

عزیزانِ گرامی قدر! سلام ورحمت۔

یوں تو ہمارا ہر درس، درسِ قرآنِ مجید ہوتا ہے جس میں، میں اپنے علم و بصیرت کی حد تک، خدا کی اس کتابِ عظیم کے حقائق و معارف، اصول و احکام اور قوانین و اقدار آپ احباب کے سامنے پیش کرتا ہوں، لیکن رمضان کے مبارک و مسعود مہینہ کا آخری درس۔ التزاماً، اِس ضابطہ ہدایت کی عظمت و انفرادیت کو اجاگر کرنے کے لئے مختص کر لیا جاتا ہے کیونکہ یہ وہ مہینہ ہے جس میں اِس سرچشمۂ نور و بصائر کے نزول کا آغاز ہوا۔ اس باعظمت مہینہ کا اختتام اُس پُرمسرت تقریب پہ ہوتا ہے جسے عید کہا جاتا ہے۔ جیسا کہ آپ احباب کو معلوم ہے عید درحقیقت جشنِ نزولِ قرآن ہے جس کے منانے کا حکم خود اس کتاب کے نازل کرنے والے' ربّ العرش' نے دے رکھا ہے۔ جب کہا کہ قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا ۭ هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ (۱۰/۵۸) یہ محض خدا کا فضل اور اس کی رحمت ہے جو اس جیسی کتاب تمہیں مل گئی۔ دنیا کی ہر متاع اس کے سامنے ہیچ ہے۔ لہٰذا، اس عطیہ خداوندی کے ملنے پر جشنِ مسرت مناؤ۔

میں نے اس تقریبِ انبساط انگیز کے سلسلہ میں کچھ عرصہ پہلے ایک درس میں کہا تھا کہ ہم اس جشن کو ہندوستان میں بھی منایا کرتے تھے لیکن وہ محض ایک رسم تھی جسے پورا کر لیا جاتا تھا —— غلامی کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی قوم کی تقدیر میں جشنوں کی مسرتیں کہاں؟ یہی وہ کرب انگیز حقیقت تھی جسے علامہ اقبالؒ نے ان زہرہ گداز لیکن بصیرت افروز الفاظ میں بیان کیا تھا کہ ؎

عیدِ آزاداں شکوہِ ملک و دیں
عیدِ محکوماں، ہجومِ مومنین

برسوں کی تگ و تاز کے بعد ہماری محکومی کی زنجیریں ٹوٹیں اور ہمیں آزادی کی فضا میں اذنِ بال کشائی ملا۔ یہ عجیب حسنِ اتفاق تھا کہ ہمیں یہ نوید آزادی رمضان کے مہینے میں ملی، اور ایک آزاد قوم کی حیثیت سے پہلی عید ... دیکھنی نصیب ہوئی۔ بے شک وہ عید، عیدِ آزاداں تھی

لیکن اس وقت ہم ایک عجیب کشمکش میں گرفتار تھے۔ ایک طرف حصولِ آزادی اور عیدِ آزاداں کے نشاط آفریں اور طرب آگیں احساسات و جذبات اور دوسری طرف، ہندوستان سے آنے والے ہمارے قافلوں کا قتلِ عام اور بقیۃُ السیف، خانماں برباد، متاع بُردہ، دشت نوردوں کی تباہ حالی اور بے سروسامانی! وہ عید اژدحامِ مسرت و شادمانی کے روح پرور اور ہجومِ مصائب و آلام کے جاں فرسا آمیزہ کی تقریب تھی۔ مجھے وہ نمازِ عید آج تک یاد ہے ــــ اور ہمیشہ یاد رہے گی۔ جسے میں نے کراچی کی پرانی، مختصر سی، عیدگاہ کے باہر، سڑک پر، قائدِ اعظمؒ سے پچھلی صف میں اس انداز سے ادا کی تھی کہ سر، حصولِ آزادی کے شکرانہ میں وقفِ سجود تھا، لیکن دل اندوہ گینیوں اور ملال آفرینیوں کے ہجوم میں طلسمِ پیچ و تاب۔ نماز کے بعد عید ملنے والوں کے انبوہ میں خود قائدِ اعظمؒ کی بھی یہ کیفیت تھی کہ ــــ جگر میں ٹیس لب ہنسنے پہ مجبور۔

اس میں شبہ نہیں کہ شدائد و نوائب کی جو قیامت ہم پر اُس وقت ٹوٹ پڑی تھی، عید کا چاند اس کے غبار میں گم ہو کر رہ گیا تھا لیکن اس کے باوجود، ہمارے درخشندہ و تابناک مستقبل کی اُمید کی شعاعیں تھیں جو ہمارے تصورات کی راتوں کو تاریک نہیں ہونے دیتی تھیں۔ اور افق سے اُس پار، ندائے جمال تھی جو پکار پکار کر کہہ رہی تھی کہ لَا تَہِنُوْا ــــ وَلَا تَحْزَنُوْا ــــ وَ اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ ــــ مت گھبراؤ۔ خوف نہ کھاؤ۔ فطرت کے اس اٹل قانون پر نگاہ رکھو ــــ کہ خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا۔

اس عید کی ماتم سامانیوں اور سیاہ پوشیوں کو ہم نے ان تابندہ اُمیدوں کے سہارے برداشت کر لیا، لیکن کس قدر جگر پاش اور جانسوز ہے یہ حقیقت کہ چھبیس سال کے عرصہ میں، ہمیں ایک عید بھی ایسی دیکھنی نصیب نہ ہوئی جسے "عیدِ آزاداں" تو ایک طرف، اپنے دورِ غلامی کی، "عیدِ محکوماں" بھی کہا جا سکے۔ اس کے برعکس ہر سال، عید کا چاند ہمارے لئے سالِ گذشتہ سے بھی بڑھ کر پیغامِ حزن و ملال لایا اور اب تو کیفیت یہ ہو چکی ہے کہ،

ہلالِ عید ہماری ہنسی اڑاتا ہے

"عیدِ آزاداں" اور "عیدِ محکوماں" کا تقابل تو اقبالؒ نے کیا تھا۔ لیکن (میرا خیال ہے کہ) ہمارے جیسی عیدِ سوگواران و ماتم گساران کا تصور اس کے افقِ خیال میں بھی نہیں آیا ہوگا۔ اچھا ہوا وہ اِس سے پہلے یہاں سے چلا گیا۔ وہ بھی اور قائدِ اعظمؒ بھی۔ شاید ان کے حسنِ نیت اور صدق و خلوص کا یہی صلہ مناسب خیال کیا گیا ہو!

ساری دُنیا تاریکی میں

لیکن اگر ہم اہلِ پاکستان شبِ زندگی کی ہولناک تاریکیوں میں گھرے ہوئے ہیں، تو اس کی سحرِ تاباں کی نمود اور بھی تو کہیں نہیں! اس وقت ہم تاریخ کے اُس دور سے گزر رہے ہیں جس میں ساری نوعِ انسان انتہائی درد و کرب میں مبتلا ہے۔ ہم طبیعی بربادیوں اور قلبی اضطرابیوں، دونوں کا شکار ہیں لیکن جو قومیں طبیعی طور پر کامیاب و کامران ہیں قلبی طور پر وہ بھی جہنم

۱؎ یہ درس ۱۹۷۳ء میں دیا گیا تھا۔

کے اس عذاب میں مبتلا ہیں جس کے متعلق قرآن نے کہا تھا کہ نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ الَّتِيْ تَطَّلِعُ عَلَى الْاَفْـئِدَةِ ۔ (۱۰۴/۶-۷) ۔ خدا (کے قانونِ مکافات) کی جلائی ہوئی آگ جس کے شعلے دلوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیتے ہیں۔ اس وقت کیفیت یہ ہے کہ دُنیا کی چھوٹی چھوٹی قومیں، اگر بڑی بڑی قوموں سے خائف ہیں تو بڑی بڑی قومیں ایک دوسرے سے لرزاں و ترساں ہیں۔ جنگل کے ہرن اگر بھیڑیوں سے ڈر رہے ہیں تو بھیڑیئے ایک دوسرے کی تاک میں بیٹھے ہیں۔ اطمینان نہ انہیں میسّر ہے نہ انہیں نصیب۔ ہم جن قوموں کے ہاں اپنے دکھوں کا مداوا مانگنے جاتے ہیں، ان کے زخموں پر سے حریری پٹیاں ہٹا کر دیکھئے تو وہ کچھ کم رِستے ہوئے ناسور دکھائی نہیں دیں گے۔ غالب کے الفاظ میں :-

ہوئی جن سے توقع خستگی کی داد پانے کی ۔۔۔ وہ ہم سے بھی زیادہ خستۂ تیغِ ستم نکلے

لیکن ہماری جگر سوزی اس لحاظ سے ان سے زیادہ کرب انگیز ہے کہ ہم ذلیل و خوار بھی ہو گئے ہیں ـــــ حتٰی کہ اُن قوموں کے سامنے بھی ذلیل و خوار، جو دُنیا میں سب سے زیادہ ذلیل و خوار شمار ہوتی تھیں۔ اور اس سے بھی آگے بڑھ کر یہ کہ ہم اپنے آپ کو خود اپنی نگاہوں میں بھی ذلیل محسوس کرنے لگ گئے ہیں۔ یہ وہ ذلت ہے جسے قرآن نے شدید ترین عذاب قرار دیا ہے جب کہا ہے کہ وَتَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ ۔ ان پر ذلت چھا جائے گی؛ كَاَنَّمَآ اُغْشِيَتْ وُجُوْهُهُمْ قِطَعًا مِّنَ الَّيْلِ مُظْلِمًا (۱۰/۲۷)۔ ایسی ذلت جیسے کسی نے ان کے چہرے پر سیاہ راتوں کی کالک مل دی ہو۔ یہ ہیں ہمارے وہ چہرے جن کے ساتھ ہم اس عید کا استقبال کرنے کے لئے نکلے ہیں!

نامساعد حالات کی ان اندوہناکیوں کے متعلق دو آراء نہیں ہو سکتیں۔ اس وقت پاکستان کا ہر مسلمان اس ملک اور اپنے مستقبل کے متعلق ہراساں نظر آتا ہے۔ جب یہاں کے عام باشندوں کی یہ حالت ہے تو آپ میرے جیسے انسان کی قلبی کیفیات کا اندازہ لگائیے کہ جس نے گذشتہ تیس چالیس سال سے اس پودے کو خونِ جگر کے ایک ایک قطرے سے سینچا ہو، اور وہ اپنی عمر کے آخری دور میں اس کا یہ انجام دیکھ رہا ہو۔ پھر میرے لئے، عزیزانِ من! یہ سوال ایک ملک یا ایک مملکت کے عروج و زوال کا نہیں۔ میرے نزدیک تو یہ ملک اور اس میں آزاد مملکت ایک بلند مقصد کے حصول کا ذریعہ تھے (اور ہے)۔ اور وہ بلند مقصد تھا دین کا قیام، یعنی ابتداءً ایک مختصر سے خطۂ زمین ہی میں سہی، صدیوں کے بعد قرآنی نظام کا قیام۔ لہٰذا، میرے لئے اس مملکت میں انتشار اور اس کا ضعف، یوں کہئے کہ دین و دنیا دونوں کے خسارہ کا موجب ہے۔ اس سے آپ میرے قلبِ حزیں کے کرب و الم کا تصور کر سکتے ہیں۔

لیکن اس کے باوجود، برادرانِ گرامی قدر! میں مایوس نہیں ـــــ میں جانتا ہوں کہ اس قسم کے الفاظ عام طور پر، رسماً بول دیئے جاتے ہیں۔ یہ نہ کہنے والوں کے دل سے اُبھرتے ہیں، نہ سننے والوں کے قلب کی گہرائیوں میں اترتے۔ لیکن میں تو ان الفاظ کو کسی پبلک پلیٹ فارم سے نشر نہیں کر رہا۔ میں انہیں بارگاہِ قرآنی میں کھڑا، خدا کی اس کتابِ عظیم کو سامنے رکھ کر کہہ رہا ہوں جہاں ایک ایک لفظ میزانِ عدل میں تولا جاتا اور کہنے والوں کی

قرآن کا طالب العلم مایوس نہیں ہو سکتا

ذمہ داریوں کو پرکھا جاتا ہے۔ اس لئے مجھ میں اور اُن حضرات میں بنیادی فرق ہے۔

اور دل کا ہے پیام اور، میرا پیام اور ہے عشق کے دردمند کا، طرزِ کلام اور ہے

میں قرآنِ حکیم کا طالب علم ہوں۔ اور جس کی نگاہوں کے سامنے قرآن کھُلا ہو، وہ کبھی مایوس نہیں ہو سکتا۔ مجھے اس کا بھی احساس ہے کہ اس مقام پر پھر یہ کہہ دیا جائے گا کہ قرآن کے متعلق بھی اس قسم کی باتیں محض برنبائے عقیدت کہدی جاتی ہیں۔ یہ بھی ٹھیک ہے۔ لیکن عقیدت اور عقیدت میں بھی فرق ہوتا ہے۔ ایک عقیدت اندھی تقلید پر مبنی ہوتی ہے، اور ایک عقیدت، غور و فکر، علم و بصیرت۔ اور دلائل و براہین کا اطمینان بخش نتیجہ۔ میری زندگی کا ابتدائی حصہ اندھی عقیدت کا تھا۔ اس زمانے میں، میں بھی اس قسم کی باتیں، محض تقلیداً کہا کرتا تھا، اس کے بعد، میری زندگی کا تنقیدی دور آیا جس میں اندھی عقیدت کا تراشیدہ ایک ایک بُت پاش پاش ہو کر رہ گیا۔ یہ لَا کا دور تھا جس میں ہر اُس عقیدے کی نفی ہوتی چلی گئی جسے بلا سوچے سمجھے اختیار کر رکھا تھا۔ اور اس کے بعد میری زندگی کا تیسرا دور شروع ہوا۔ جس میں، میں نے جس عقیدہ کو مانا، علیٰ وجہ البصیرت مانا۔ اس طرح میں، یوں کہئے، کہ قرآنِ عظیم کی صداقتوں پر از سرِ نو ایمان لایا۔ لہٰذا، اب میں اگر قرآن کے متعلق کچھ کہتا ہوں۔ تو وہ اندھی عقیدت پر مبنی نہیں ہوتا، بلکہ اُس یقین پر مبنی ہوتا ہے جو علم و بصیرت کا پیدا کردہ ہے۔ اور یہی ہے وہ یقین جس کی بناء پر میں پکار کر کہتا ہوں کہ جس کے سامنے قرآن کھُلا ہو، وہ کبھی مایوس نہیں ہو سکتا۔

آپ کو معلوم ہے کہ انسان پر مایوسی کس وقت طاری ہوتی ہے؟ اسے ایک مثال سے سمجھئے۔ آپ کسی لق و دق صحرا میں سفر کر رہے ہوں، اس طرح کہ نہ کوئی رفیق ساتھ ہو، نہ زادِ راہ پاس۔ راستہ بے حد دشوار گذار ہو اور منزل بڑی کٹھن۔ یہ تمام حالات ایسے ہیں جن میں مسافر پریشان ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر صورت یہ ہو کہ جس راستے پر آپ جا رہے ہوں، اس کے صحیح ہونے پر آپ کو یقین ہو، تو آپ ان صعوباتِ سفر کے باوجود مایوس نہیں ہوں گے۔

اِنسان مایوس کب ہوتا ہے

اس کے برعکس اگر کیفیت یہ ہو کہ اس صحرا میں آپ راستہ کھو جائیں۔ نہ کوئی نشانِ منزل آپ کے سامنے ہو اور نہ ہی کوئی بتانے والا۔ تو آپ راستے کی ناکام تلاش کے بعد جب تھک کر بیٹھ جائیں گے تو اس وقت آپ پر مایوسی طاری ہو جائے گی۔ لہٰذا، انسان مایوسی کا شکار اس وقت ہوتا ہے جب اسے مشکلات سے نکلنے کا کوئی راستہ نہ ملے۔ اس حقیقت کو قرآنِ کریم نے ان چار مختصر الفاظ میں بیان کر دیا ہے جب کہا کہ وَ مَنْ يَّقْنَطُ مِن رَّحْمَةِ رَبِّهٖٓ اِلَّا الضَّآلُّوْنَ (۱۵/۵۶)۔ خدا کی رحمت سے صرف وہ لوگ نا اُمید ہوتے ہیں جنہوں نے راستہ کھو دیا ہو۔ یہاں اس حقیقت کو ایک اصولی نکتہ کی حیثیت سے بیان کیا گیا ہے۔ دیگر مقامات پر اس اجمال کی تفصیل دی گئی ہے۔ ایک جگہ کہا ہے کہ اگر صورت یہ ہو کہ ایک رہ نورد، اپنا راستہ بھول گیا ہو۔ کوئی راہ نما اسے نشاناتِ راہ کا پتہ نشان بتا دے، وہ نشانات اس کے سامنے بھی آ جائیں لیکن وہ انہیں صحیح ماننے سے انکار کر دے۔ تو ظاہر ہے کہ وہ بھی منزل تک نہیں پہنچ سکے گا۔ بدستور مایوسیوں کا شکار رہے گا۔ سورہ عنکبوت میں ہے: وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ

یونہی مذاق نہیں۔ تم سمجھتے ہو کہ یہ محض "شاعری ہے جسے زمانے کی گردشیں خود بخود مٹادیں گی": (اَمْ یَقُوْلُوْنَ شَاعِرٌ نَّتَرَبَّصُ بِهٖ رَیْبَ الْمَنُوْنِ (۵۲/۳۰)۔ یہ غلط ہے: فَلَآ اُقْسِمُ بِمَا تُبْصِرُوْنَ۔ وَمَا لَا تُبْصِرُوْنَ وہ تمام حقائق جو تمہاری نگاہوں کے سامنے آچکے ہیں اور جو تمہاری نگاہوں سے مستور ہیں، وہ سب اس حقیقت پر شاہد ہیں کہ اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ۔ وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ (۶۹/۳۹-۴۰) یہ (قرآن) ایک واجب التکریم پیغمبرؐ کی وساطت سے پہنچنے والے ابدی حقائق کا مجموعہ ہے۔ محض شاعرانہ تخیلات کا نگار فریب مرقع نہیں: وَلَا بِقَوْلِ كَاهِنٍ (۶۹/۴۲)۔ نہ ہی یہ کسی اٹکل پچو باتیں بتانے والے نجومی کی قیاس آرائیاں ہیں۔ بلکہ تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ (۶۹/۴۳)۔ یہ اس خدا کی طرف سے نازل کردہ قوانین کا ضابطہ ہے جو تمام کائنات کا نشو و نما دینے والا ہے۔ ہر شے کو آہستہ آہستہ، بتدریج اس کے نقطۂ آغاز سے معراجِ تکمیل تک پہنچانے والا۔ اس قسم کے حقائق نہ کوئی شاعر دے سکتا ہے نہ سر پھرا دیوانہ: وَيَقُوْلُوْنَ اَئِنَّا لَتَارِكُوْٓا اٰلِهَتِنَا لِشَاعِرٍ مَّجْنُوْنٍ (۳۷/۳۶) بَلْ جَآءَ بِالْحَقِّ (۳۷/۳۷)۔ یہ وہی دے سکتا ہے جو خدا کی طرف سے، تعمیری نتائج پیدا کرنے والی مثبت حقیقت لایا ہو؛ وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهٗ۔ ہم نے اپنے رسول کو شاعری نہیں سکھائی۔ نہ ہی شاعری اس کے شایانِ شان تھی۔ جو زندگی بخش، حیات آور، پیغامِ انقلاب کا حامل ہو، اُسے شاعری سے کیا کام؟ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ وَّقُرْاٰنٌ مُّبِيْنٌ۔ یہ ان ابدی حقیقتوں کی یاد دہانی ہے جنہیں تم نے فراموش کر رکھا ہے۔ یہ ایک ضابطۂ زندگی ہے جو اپنی بات کو نہایت ابھرے اور نکھرے ہوئے انداز سے تمہارے سامنے پیش کرتا ہے: لِّيُنْذِرَ مَنْ كَانَ حَيًّا وَّيَحِقَّ الْقَوْلُ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ (۳۶/۶۹-۷۰) تاکہ ہر اس شخص کو جس میں زندگی کی رمق باقی ہے، غلط روش پر چلنے کے ہلاکت انگیز عواقب سے آگاہ کر دے اور جو لوگ اس کے باوجود اسی (غلط) روش پر چلتے جائیں وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں کہ جو کچھ اس نے کہا تھا وہ کس طرح حقیقت پر مبنی تھا۔ اس لئے کہ اِنَّهٗ لَقَوْلٌ فَصْلٌ وَّمَا هُوَ بِالْهَزْلِ (۸۶/۱۳-۱۴)۔ یہ فیصلہ کن بات کرتا ہے۔ یونہی مذاق نہیں کرتا۔ چونکہ تم غور و فکر سے کام نہیں لیتے اس لئے اس کی عظمت کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ اس کی عظمت اور اثر انگیزی کا تو یہ عالم ہے کہ لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ (۵۹/۲۱)۔ اگر (استعارہ کے طور پر) ہم اسے قلبِ کوہ کے اندر رکھ دیتے (اور اسے احساس عطا کر دیتے تو) تو دیکھتا کہ اس کی خلاف ورزی کے ہلاکت آفریں نتائج کے احساس سے اس کی سختی کس طرح نرم پڑ جاتی اور کس طرح اس کا جگر شق ہو جاتا۔ اس لئے کہ اِنَّهٗ لَقَوْلٌ فَصْلٌ وَّمَا هُوَ بِالْهَزْلِ۔ فَصْلٌ کے معنی ہوتے ہیں الگ الگ کر دینا۔ متمیز کر دینا۔ حق کو باطل سے جدا کر کے دکھا دینا۔ غلط کو صحیح سے الگ کر کے بتا دینا۔ اسی کے لئے دوسری جگہ کہا: حٰمٓ وَالْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ: "یہ ایک ایسا ضابطۂ قوانین ہے جو خود بھی واضح اور صاف ہے اور ہر بات کو نہایت وضاحت اور صراحت سے ابھار کر اور نکھار کر بیان کر دیتا ہے"۔ اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ اِنَّا كُنَّا مُنْذِرِيْنَ۔ "ہم نے اس کا آغازِ نزول (رمضان کے مہینے کی ایک) ایسی شب میں کیا جو تمام نوعِ انسانی کے لئے نہایت برکت و سعادت کا موجب بن گئی"۔ یہ کتاب ہمارے اس قانون (سنت اللہ)

کے مطابق نازل ہوئی جس کی رُو سے ہم شروع سے انسان کو اس کی غلط روش کے تباہ کُن نتائج سے آگاہ کرتے چلے آرہے ہیں۔ فِيهَا يُفْرَقُ كُلُّ أَمْرٍ حَكِيمٍ (۴۴/۴)۔ "اس میں ان تمام امور کو جو حکمت پر مبنی ہیں (غلط امور سے) الگ کر کے رکھ دیا گیا ہے"۔

یہ ہے وہ کتاب جس کا تعارف خود صاحبِ کتاب (خدائے حکیم) نے اس انداز سے کرایا ہے۔ میں نے

قرآن خود روشنی ہے

پہلے کہا ہے کہ قرآن رحمت اس لئے ہے کہ یہ رہ نوردِ دشتِ حیات کی راہ نمائی صحیح منزل کی طرف کرتا ہے۔ اس راہ نمائی کے متعلق بھی قرآنِ کریم نے بڑی وضاحت سے بتایا ہے لیکن میں یہاں (بغرضِ اختصار) سورۂ مائدہ کی دو آیات پیش کرنے پر اکتفا کروں گا۔ ان میں کہا گیا ہے کہ قَدْ جَاءَكُمْ مِنَ اللَّهِ نُورٌ وَكِتَابٌ مُبِينٌ۔ "خدا کی طرف سے تمہارے پاس ایک نور، ایک روشنی آگئی۔ یعنی ایک ایسی کتاب جو بالکل واضح ہے"۔ ظاہر ہے کہ روشنی اپنی دلیل آپ ہوتی ہے۔ اسے تلاش کرنے یا دیکھنے کے لئے کسی اور روشنی کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اگر کسی کمرے میں بجلی کا قمقمہ روشن ہو تو آپ وہاں دیا جلا کر نہیں لے جاتے کہ دیکھیں بجلی کا قمقمہ کہاں ہے اور کیسا ہے! یہ مفہوم ہے ایسا کہنے کا کہ روشنی اپنی دلیل آپ ہوتی ہے۔ اسے دیکھنے کے لئے کسی اور روشنی کی ضرورت نہیں ہوتی، اس سے فائدہ اٹھانے کے لئے البتہ انسانی آنکھ کی ضرورت ہوتی ہے۔ روشنی اُسے ہی فائدہ دے سکتی ہے جو اپنی آنکھیں کھلی رکھے۔ جو آنکھیں بند رکھے، اس کے لئے روشنی کا عدم اور وجود برابر ہوتا ہے۔ قرآن کے سراجِ منیر سے مستفید ہونے کے لئے انسانی عقل و فکر کی آنکھ کا کھلا رہنا ضروری ہے۔ جو لوگ عقل و فکر سے کام نہیں لیتے، انہیں یہ جگمگاتا چراغ بھی کچھ فائدہ نہیں پہنچا سکتا۔

یہ ہے وہ مشعل، وہ سراجِ منیر، وہ جگمگاتا چراغ جو سفرِ زندگی میں راہ نمائی کا کام دیتا ہے۔ یہ چراغ کرتا کیا ہے! يَهْدِي بِهِ اللَّهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهُ سُبُلَ السَّلَامِ (۵/۱۶)۔ "یہ سلامتی کے راستوں کی طرف راہ نمائی کرتا ہے"۔ سلام، بڑا جامع لفظ ہے۔ عام طور پر یہ لفظ "خطرات سے محفوظ رہنے" کے لئے بولا جاتا ہے۔ لیکن اس کا مفہوم اتنا ہی نہیں۔ اس سے زیادہ وسیع ہے۔ اس کا مفہوم ہوتا ہے کسی کو خطرات سے محفوظ رکھ کر اسے تکمیل کی منزل تک پہنچا دینا۔ یہ کاروانِ انسانیت کی خطرات سے حفاظت کس طرح کرتا ہے؟ يُخْرِجُهُمْ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ ـــــ یہ انہیں، زندگی کی ہولناک تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف لے آتا ہے اور اس طرح يَهْدِيهِمْ إِلَىٰ صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ (۵/۱۵-۱۶) ان کی راہنمائی زندگی کے سیدھے، توازن بدوش راستے کی طرف کر دیتا ہے۔ یہاں صراطِ مستقیم کہا ہے۔ دوسری جگہ ہے: إِنَّ هَٰذَا الْقُرْآنَ يَهْدِي لِلَّتِي هِيَ أَقْوَمُ (۱۷/۹)۔ یقیناً یہ قرآن، نوعِ انسان کی راہ نمائی اس راستے کی طرف کرتا ہے جو اقوم ہے ـــــ سب سے زیادہ متوازن راہ۔ اور یہ تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ زندگی کے قیام کا دار و مدار توازن پر ہے۔ جس کا توازن بگڑ جائے، چلنا تو ایک طرف، وہ اپنے پاؤں پر کھڑا بھی نہیں رہ سکتا ـــــ ہماری زبوں حالی اور حرماں نصیبی کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ ہمارے معاشرہ کا توازن بگڑ چکا ہے۔ نہ ہماری انفرادی زندگی متوازن (BALANCED) رہی ہے نہ معاشرہ متوازن۔ قرآن، افراد اور اقوام

بلکہ نوعِ انسان کا بگڑا ہوا توازن درست کر دیتا اور اس طرح انہیں چلنے کے قابل بنا دیتا ہے۔ اس مقام پر ضمناً اتنا اور سمجھ لیجئے کہ قرآن صحیح راستے کی طرف راہ نمائی کرتا ہے۔ وہ یہ بتاتا ہے کہ صحیح راستہ کونسا ہے۔ کسی کو اٹھا کر خود منزل تک نہیں پہنچا دیتا۔ منزل تک پہنچنے کے لئے چلنا، مسافر کو خود ہی پڑتا ہے۔ ایمان کے ساتھ اعمالِ صالح کی شرط سے یہی مراد ہے۔ ایمان ہوتا ہے راستے کے صحیح ہونے پر یقین محکم، اور عمل صالح کے معنی ہوتے ہیں اس راستے پر چلتے جانا۔ جو مسافر راستے کی صحت پر یقین کے دعوے کے باوجود، بیٹھا رہتا ہے، چلتا نہیں، راستے کی صحت اسے بھی کچھ فائدہ نہیں دے سکتی۔

ہم نے دیکھا ہے کہ قرآن زندگی کی راہوں کو روشن کر دیتا ہے۔ اس سے یہ سوال سامنے آتا ہے کہ وہ کون سے راہزن ہیں جو اس راستے میں روک بن کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور کاروانِ انسانیت کو غلط راہوں پر ڈال دیتے ہیں۔ اس سوال اور اس کے جواب کا سمجھ لینا نہایت ضروری ہے۔ کیونکہ اس کے بغیر ہم صحیح راستے کی طرف قدم ہی نہیں اٹھا سکتے۔ لیکن اسے سمجھنے کے لئے، یہ سمجھ لینا بھی ضروری ہے کہ قرآن کا پیغام کیا ہے؟ اور یہ راہزن اس کی مخالفت کیوں کرتے ہیں۔

جہاں تک قرآن کی تعلیم کا تعلق ہے اس کا ملخص اقبالؒ نے ایک مصرعہ میں ایسے حسن کارانہ ایجاز سے سمو کر رکھ دیا ہے جس پر کسی اضافہ کی ضرورت نہیں۔ انہوں نے کہا ہے کہ قرآن!

موت کا پیغام ہر نوعِ غلامی کے لئے

اب یہ ظاہر ہے کہ جب یہ ہر نوع غلامی کے لئے موت کا پیغام ہے، جو مستبد قوتیں دوسرے انسانوں کو اپنی محکومی اور محتاجی کے مرئی اور غیر مرئی شکنجوں میں کس کر رکھتی تھیں، وہ اس کی آواز کو کس طرح برداشت کر سکتی تھیں۔ یہ تھیں وہ قوتیں جو اس دعوتِ خداوندی کی مخالفت میں اپنا پورا زور صرف کر دیتی تھیں۔ واضح رہے کہ یہ پیغامِ خداوندی قرآن کے ذریعے پہلی بار انسانیت تک نہیں پہنچایا گیا۔ جب سے آسمانی سلسلۂ رشد و ہدایت شروع ہوا، ہر رسول کے ذریعے یہی پیغام دیا گیا۔ اور اسی بنا پر رسول کی قوم نے اس کی مخالفت کی۔ اس سلسلۂ انبیاء کرام کی آخری کڑی حضور نبی اکرمؐ کی ذاتِ گرامی تھی۔ چونکہ حضورؐ کے بعد وحی کا سلسلہ ختم کر دیا گیا تھا اس لئے یہ پیغامِ خداوندی اپنی آخری اور مکمل شکل میں محفوظ کر دیا گیا۔

سلسلۂ انبیاء کرامؑ تو حضورؐ کی ذاتِ اقدس پر ختم ہو گیا، لیکن دعوتِ انبیاء کرامؑ کا سلسلہ ختم نہیں ہوا۔ اس دعوت کے پیش کرنے کے لئے خدا کی طرف سے اب کسی رسول کے آنے کی ضرورت نہیں۔ یہ فریضہ امّتِ محمدیہؐ کے سپرد کر دیا گیا جب کہا کہ ثُمَّ اَوۡرَثۡنَا الۡكِتٰبَ الَّذِيۡنَ اصۡطَفَيۡنَا مِنۡ عِبَادِنَا (۳۵/۳۲)۔ "پھر ہم نے اس کتاب کا وارث ان لوگوں کو بنا دیا جنہیں اس مقصد کے لئے منتخب کیا گیا تھا"۔ اب اطاعتِ خداوندی کی دعوت کا فریضہ امّتِ محمدیہؐ کو سونپ دیا گیا ہے۔

یہ ظاہر ہے کہ جب وہ دعوت موجود ہو گی تو اس کی مخالفت کرنے والے عناصر بھی موجود رہوں گے۔ کشمکشِ حق و باطل ازل سے چلی آ رہی ہے اور ابد تک رہے گی۔ اس تیرہ سو سال میں یہ دعوت کس طرح

پیش کی گئی اور اس کی مخالفت کس کس انداز سے ہوئی، اس تفصیل سے صرفِ نظر کر کے، مجھے دورِ حاضر کی طرف آجانا چاہیئے۔ اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ مملکتِ پاکستان کے مطالبہ کا تقاضا، مقصود اور منتہیٰ کیا تھا تو میں ایک فقرہ میں کہہ دوں گا کہ اس کا مقصود یہ تھا کہ ایک ایسا خطۂ زمین وجود میں آجائے جہاں انسان، انسانوں کی محکومی سے نجات حاصل کر کے، خالصتہً قوانینِ خداوندی کی اطاعت اختیار کرنے کے قابل ہو سکے یعنی ایسی مملکت جس میں حکومت صرف خدا کی کتاب کی ہو۔ پاکستان کا تصوّر دینے والے اقبالؒ نے اپنے عمر بھر کے فکر و تدبّر کے بعد، اس حقیقت کو پالیا تھا کہ ہماری، ذلتوں اور ناکامیوں کا بنیادی سبب یہ ہے کہ ہم نے خدا کی کتاب سے اعراض برت رکھا ہے۔ اسی لئے اس نے مسلمانوں سے کہا تھا کہ ؎

خوار از مہجوریِ قرآں شدی   شکوہ سنجِ گردشِ دوراں شدی

تم خواہ مخواہ زمانے کی گردشوں اور حالات کی نامساعدتوں کا شکوہ کرتے پھر رہے ہو۔ تمہاری ذلت و خواری کا حقیقی سبب یہ ہے کہ تم نے قرآن کو چھوڑ رکھا ہے۔ لہٰذا :- ؎

گر تو می خواہی مسلمان زیستن   نیست ممکن جز بقرآن زیستن

اقبالؒ کے تتبع میں یہی آواز قائداعظمؒ بھی بلند کرتے رہے۔ اقبالؒ، پاکستان کے وجود میں آنے سے پہلے ہی دنیا سے رخصت ہو گئے اور قائداعظمؒ اس کے فوری بعد ہم سے جدا ہو گئے۔ میں قرآن کریم کا طالبعلم

میری قرآنی دعوت

ہوں اس لئے یہ فریضہ میں نے اپنے ذمے لیا کہ اس دعوت کو عام کروں کہ اسلامی مملکتِ پاکستان میں اطاعت و محکومیت صرف کتاب اللہ کی ہوگی۔ اقتدار اسی کو حاصل ہوگا، اور کسی کو نہیں۔ ادھر سے یہ دعوت پیش ہوئی اور جیسا کہ ہوتا چلا آرہا تھا۔ اس کے مخالفین ہجوم کر کے اٹھ کھڑے ہوئے۔ مملکتِ پاکستان کی ساری تاریخ اسی کشمکش کی عبرت آموز داستان ہے۔ جیسا کہ قرآنِ کریم ہمیں بتاتا ہے کہ حق کے مخالفین نے کبھی یہ نہیں کیا کہ کسی داعی الی الحق سے یہ کہا ہو کہ آؤ! ہم تمہاری بات کو علم و بصیرت کی کسوٹی پر پرکھ کر دیکھتے ہیں۔ اگر یہ معیارِ حق و صداقت پر پوری اتری تو اسے اختیار کر لیا جائے گا۔ اور اگر یہ صحیح ثابت نہ ہوئی تو اسے مسترد کر دیا جائے گا۔ انہوں نے کبھی ایسا نہیں کیا، اس لئے کہ وہ جانتے ہیں کہ علم و بصیرت کی بارگاہ سے کبھی ان کے حق میں فیصلہ نہیں ہوگا۔ انہوں نے ہمیشہ یہ وطیرہ اختیار کیا ہے کہ اس داعی کے خلاف طرح طرح کی الزام تراشیوں سے عوام کے جذبات کو مشتعل کر دیا۔ جب حضور نبی اکرمؐ نے اپنی دعوت کو پیش کیا تو مخالفین نے جو جو حربے استعمال کئے، قرآن اسے تفصیل سے بیان کرتا ہے۔ آپؐ کو مفتری کہا گیا۔ کذّاب کہا گیا۔ پاگل (مجنوں) کہا گیا۔ مسحور کہا گیا۔ کاہن کہا گیا۔ شاعر کہا گیا۔ آپؐ کا ہر طرح سے مذاق اڑایا گیا۔ استہزا کیا گیا۔ غرضیکہ کوئی الزام ایسا نہیں تھا جسے حضورؐ کے خلاف تراشا نہ گیا ہو، اور کوئی حربہ ایسا نہیں تھا جسے استعمال نہ کیا گیا ہو۔ حضورؐ جس جگہ یہ آواز بلند کرتے، یہ لوگ ہجوم کر کے آجاتے اور عوام سے کہتے کہ لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ (۴۱/۲۶)۔ "تم اس قرآن کو نہ خود سنو، نہ دوسروں کو سننے دو۔ جہاں اسے پیش کیا جائے، خوب شور مچاؤ، تاکہ لوگ اسے سن ہی نہ سکیں"۔ یہی ایک طریق

بلکہ نوعِ انسان کا بگڑا ہوا توازن درست کر دیتا اور اس طرح انہیں چلنے کے قابل بنا دیتا ہے۔ اس مقام پر ضمناً اتنا اور سمجھ لیجئے کہ قرآن صحیح راستے کی طرف راہ نمائی کرتا ہے۔ وہ یہ بتاتا ہے کہ صحیح راستہ کونسا ہے۔ کسی کو اٹھا کر خود منزل تک نہیں پہنچا دیتا۔ منزل تک پہنچنے کے لئے چلنا، مسافر کو خود ہی پڑتا ہے۔ ایمان کے ساتھ اعمالِ صالح کی شرط سے یہی مراد ہے۔ ایمان ہوتا ہے راستے کے صحیح ہونے پر یقین محکم، اور عمل صالح کے معنی ہوتے ہیں اس راستے پر چلتے جانا۔ جو مسافر راستے کی صحت پر یقین کے دعوے کے باوجود، بیٹھا رہتا ہے، چلتا نہیں، راستے کی صحت اسے بھی کچھ فائدہ نہیں دے سکتی۔

ہم نے دیکھا ہے کہ قرآن زندگی کی راہوں کو روشن کر دیتا ہے۔ اس سے یہ سوال سامنے آتا ہے کہ وہ کون سے راہزن ہیں جو اس راستے میں روک بن کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور کاروانِ انسانیت کو غلط راہوں پر ڈال دیتے ہیں۔ اس سوال اور اس کے جواب کا سمجھ لینا نہایت ضروری ہے۔ کیونکہ اس کے بغیر ہم صحیح راستے کی طرف قدم ہی نہیں اٹھا سکتے۔ لیکن اسے سمجھنے کے لئے، یہ سمجھ لینا بھی ضروری ہے کہ قرآن کا پیغام کیا ہے؟ اور یہ راہزن اس کی مخالفت کیوں کرتے ہیں۔

جہاں تک قرآن کی تعلیم کا تعلق ہے اس کا ملخص اقبالؒ نے ایک مصرعہ میں ایسے حسن کارانہ ایجاز سے سمو کر رکھ دیا ہے جس پر کسی اضافہ کی ضرورت نہیں۔ انہوں نے کہا ہے کہ قرآن!

موت کا پیغام ہر نوعِ غلامی کے لئے

اب یہ ظاہر ہے کہ جب یہ ہر نوع غلامی کے لئے موت کا پیغام ہے، جو مستبد قوتیں دوسرے انسانوں کو اپنی محکومی اور محتاجی کے مرئی اور غیر مرئی شکنجوں میں کس کر رکھتی تھیں، وہ اس کی آواز کو کس طرح برداشت کر سکتی تھیں۔ یہی تھیں وہ قوتیں جو اس دعوتِ خداوندی کی مخالفت میں اپنا پورا زور صرف کر دیتی تھیں۔ واضح رہے کہ یہ پیغامِ خداوندی قرآن کے ذریعے پہلی بار انسانیت تک نہیں پہنچایا گیا۔ جب سے آسمانی سلسلۂ رشد و ہدایت شروع ہوا، ہر رسول کے ذریعے یہی پیغام دیا گیا۔ اور اسی بنا پر رسول کی قوم نے اس کی مخالفت کی۔ اس سلسلۂ انبیاء کرام کی آخری کڑی حضور نبی اکرمؐ کی ذاتِ گرامی تھی۔ چونکہ حضورؐ کے بعد وحی کا سلسلہ ختم کر دیا گیا تھا اس لئے یہ پیغامِ خداوندی اپنی آخری اور مکمل شکل میں محفوظ کر دیا گیا۔

سلسلۂ انبیاء کرامؑ تو حضورؐ کی ذاتِ اقدس پر ختم ہو گیا، لیکن دعوتِ انبیاء کرامؑ کا سلسلہ ختم نہیں ہوا۔ اس دعوت کے پیش کرنے کے لئے خدا کی طرف سے اب کسی رسول کے آنے کی ضرورت نہیں۔ یہ فریضہ امتِ محمدیہؐ کے سپرد کر دیا گیا جب کہا کہ ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْكِتٰبَ الَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا (۳۵/۳۲)۔ "پھر ہم نے اس کتاب کا وارث ان لوگوں کو بنا دیا جنہیں اس مقصد کے لئے منتخب کیا گیا تھا"۔ اب اطاعتِ خداوندی کی دعوت کا فریضہ امتِ محمدیہؐ کو سونپ دیا گیا ہے۔

یہ ظاہر ہے کہ جب وہ دعوت موجود ہو گی تو اس کی مخالفت کرنے والے عناصر بھی موجود رہیں گے، کہ کشمکشِ حق و باطل ازل سے چلی آ رہی ہے اور ابد تک رہے گی۔ اس تیرہ سو سال میں یہ دعوت کس طرح

پیش کی گئی اور اس کی مخالفت کس کس انداز سے ہوئی، اس تفصیل سے صرفِ نظر کر کے، مجھے دورِ حاضر کی طرف آجانا چاہیئے۔ اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ مملکتِ پاکستان کے مطالبہ کا تقاضا، مقصود اور منتہیٰ کیا تھا تو میں ایک فقرہ میں کہہ دوں گا کہ اس کا مقصود یہ تھا کہ ایک ایسا خطۂ زمین وجود میں آجائے جہاں انسان، انسانوں کی محکومی سے نجات حاصل کر کے، خالصتہً قوانینِ خداوندی کی اطاعت اختیار کرنے کے قابل ہو سکے یعنی ایسی مملکت جس میں حکومت صرف خدا کی کتاب کی ہو۔ پاکستان کا تصور دینے والے اقبالؒ نے اپنے عمر بھر کے فکر و تدبر کے بعد، اس حقیقت کو پالیا تھا کہ ہماری، ذلتوں اور ناکامیوں کا بنیادی سبب یہ ہے کہ ہم نے خدا کی کتاب سے اعراض برت رکھا ہے۔ اسی لئے اس نے مسلمانوں سے کہا تھا کہ ؎

خوار از مہجوریِ قرآں شدی   شکوہ سنجِ گردشِ دوراں شدی

تم خواہ مخواہ زمانے کی گردشوں اور حالات کی نامساعدتوں کا شکوہ کرتے پھر رہے ہو۔ تمہاری ذلت و خواری کا حقیقی سبب یہ ہے کہ تم نے قرآن کو چھوڑ رکھا ہے۔ لہٰذا :- ؎

گر تو می خواہی مسلمان زیستن   نیست ممکن جز بقرآں زیستن

اقبالؒ کے تتبع میں یہی آواز قائداعظمؒ بھی بلند کرتے رہے۔ اقبالؒ، پاکستان کے وجود میں آنے سے پہلے ہی دنیا سے رخصت ہو گئے اور قائداعظمؒ اس کے فوری بعد ہم سے جدا ہو گئے۔ میں قرآن کریم کا طالب علم

میری قرآنی دعوت

ہوں اس لئے یہ فریضہ میں نے اپنے ذمے لیا کہ اس دعوت کو عام کروں کہ اسلامی مملکتِ پاکستان میں اطاعت و محکومیت صرف کتاب اللہ کی ہوگی۔ اقتدار اسی کو حاصل ہو گا، اور کسی کو نہیں۔ ادھر سے یہ دعوت پیش ہوئی اور جیسا کہ ہوتا چلا آرہا تھا۔ اس کے مخالفین ہجوم کر کے اٹھ کھڑے ہوئے۔ مملکتِ پاکستان کی ساری تاریخ اسی کشمکش کی عبرت آموز داستان ہے۔ جیسا کہ قرآنِ کریم ہمیں بتاتا ہے کہ حق کے مخالفین نے کبھی یہ نہیں کیا کہ کسی داعی الی الحق سے یہ کہا ہو کہ آؤ! ہم تمہاری بات کو علم و بصیرت کی کسوٹی پر پرکھ کر دیکھتے ہیں۔ اگر یہ معیارِ حق و صداقت پہ پوری اتری تو اسے اختیار کر لیا جائے گا۔ اور اگر یہ صحیح ثابت نہ ہوئی تو اسے مسترد کر دیا جائے گا۔ انہوں نے کبھی ایسا نہیں کیا، اس لئے کہ وہ جانتے ہیں کہ علم و بصیرت کی بارگاہ سے کبھی ان کے حق میں فیصلہ نہیں ہو گا۔ انہوں نے ہمیشہ یہ وطیرہ اختیار کیا ہے کہ اس داعی کے خلاف طرح طرح کی الزام تراشیوں سے عوام کے جذبات کو مشتعل کر دیا۔ جب حضور نبی اکرمؐ نے اپنی دعوت کو پیش کیا تو مخالفین نے جو جو حربے استعمال کئے، قرآن اسے تفصیل سے بیان کرتا ہے۔ آپؐ کو مفتری کہا گیا۔ کذاب کہا گیا۔ پاگل (مجنوں) کہا گیا۔ مسحور کہا گیا۔ کاہن کہا گیا۔ شاعر کہا گیا۔ آپؐ کا ہر طرح سے مذاق اڑایا گیا۔ استہزا کیا گیا۔ غرضیکہ کوئی الزام ایسا نہیں تھا جسے حضورؐ کے خلاف تراشا نہ گیا ہو، اور کوئی حربہ ایسا نہیں تھا جسے استعمال نہ کیا گیا ہو۔ حضورؐ جس جگہ یہ آواز بلند کرتے، یہ لوگ ہجوم کر کے آجاتے اور عوام سے کہتے کہ لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ (۴۱/۲۶)۔ "تم اس قرآن کو نہ خود سنو، نہ دوسروں کو سننے دو۔ جہاں اسے پیش کیا جائے، خوب شور مچاؤ، تاکہ لوگ اسے سن ہی نہ سکیں"۔ یہی ایک طریق

ہے جس سے تم اس آواز کو دبا سکتے ہو"۔ اگر لوگوں نے اُسے سُن لیا تو پھر یہ اپنا اثر کئے بغیر نہیں رہے گی۔

میرے خلاف الزامات

عزیزانِ من! مجھے حضور نبی اکرمؐ کی ذاتِ اقدس و اعظمؐ سے کیا نسبت؟ لیکن چونکہ، سُنّتِ رسول اللہؐ کے اتباع میں مَیں بھی وہی کہتا ہوں جسے حضورؐ پیش فرماتے تھے، یعنی اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ (۷/۳)۔ "اتباع صرف کتابِ خداوندی کا کرو، اس کے سوا کسی کا اتباع نہ کرو"۔ اس لئے اس دعوت کی مخالفت میں حربے بھی وہی استعمال کئے گئے۔ یعنی الزام تراشیاں اور اشتعال انگیزیاں —— یہ مدعیٔ نبوت ہونے کی تیاریاں کر رہا ہے۔ ایک نیا مذہب ایجاد کرنا چاہتا ہے۔ تین نمازیں اور ۹ دن کے روزے بتاتا ہے۔ کہتا ہے اُردو میں نماز پڑھا کرو۔ یہ اور اسی قسم کے اور سینکڑوں بے بنیاد الزامات اور لوگوں سے تاکید کہ اس کے پاس کبھی نہ بیٹھو۔ اس کے درس میں کبھی نہ جاؤ۔ اس کی کتابوں کو ہاتھ نہ لگاؤ۔ انہیں چھوؤ تک نہیں ورنہ تمہارا ایمان جاتا رہے گا۔ تم بھی اسی کی طرح گمراہ اور بے دین ہو جاؤ گے۔ یعنی وہی پرانا حربہ کہ لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِيْهِ (۴۱/۲۶)۔ "قرآن کی آواز مت سنو خود بھی نہ سنو اور شور مچاتے رہو تاکہ دوسرے بھی اسے سننے نہ پائیں"۔

مَیں مایوس نہیں

میں جانتا ہوں کہ اس مقام پر آپ مجھ سے یہ سوال کریں گے کہ تم نے شروع میں کہا تھا کہ میں مایوس نہیں، لیکن حالات کے تجزیہ کے بعد جو نتیجہ سامنے آتا ہے وہ پہلے سے بھی زیادہ مایوس کن ہے۔ پھر تم مایوس کس طرح نہیں ہو؟ حالات یقیناً ایسے ہی ہیں، لیکن اس کے باوجود عزیزانِ من! قرآن کے طالبِ علم کے لئے مایوسی کی کوئی بات نہیں! شامِ صحرا کی سی ہولناک خاموشیوں اور عمقِ بحر کی سی روح فرسا تاریکیوں میں، یہ نشیدِ جانفزا برابر اس کے لئے فردوسِ گوش بنتی رہتی ہے کہ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓي اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ۔ اے میرے بندو جو اپنے آپ پر زیادتیاں کر چکے ہو۔ اللہ کی رحمت سے مایوس مت ہو۔ خدا تمہاری کوتاہیوں اور لغزشوں کے پیدا کردہ خطرات سے تمہاری حفاظت کا سامان پیدا کرے گا: اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ۔ وہ سامانِ حفاظت بھی عطا کرے گا اور اسبابِ رحمت بھی۔ اس کے لئے کرنے کا کام یہ ہے: وَاَنِيْبُوْٓا اِلٰى رَبِّكُمْ وَاَسْلِمُوْا لَهٗ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ الْعَذَابُ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ۔ "تم اپنے نشوونما دینے والے کی طرف لوٹ کر آ جاؤ قبل اس کے کہ آخری تباہی تمہیں آن گھیرے۔ اس صورت میں کوئی بھی تمہاری مدد نہیں کر سکے گا"۔ اور اس کا عملی طریقہ یہ کہ وَاتَّبِعُوْٓا اَحْسَنَ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ الْعَذَابُ بَغْتَةً وَّاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ (۳۹/۵۵-۵۳)۔ "جو کچھ خدا نے تمہاری طرف نازل کیا ہے، اس کی بطریقِ احسن پیروی کرو، قبل اس کے کہ آخری تباہی تمہیں اس طرح آ پکڑے کہ تمہیں پتہ ہی نہ چلے کہ یہ کہاں سے آ گئی اور کیسے آ گئی"۔

قرآن نے یہ امیدوں بھرا پیغام، آج سے چودہ سو سال پہلے، خطۂ عرب میں بسنے والی قوم ہی کو نہیں

دیا تھا۔ اس کا یہ پیغام آج بھی اسی طرح زندہ و پائندہ ہے اور دنیا کی ہر اس قوم کے لئے حفاظت اور زندگی کی ضمانت کا مدعیٔ جس نے اپنے آپ پر زیادتی کر لی ہو۔ اس قسم کے پیغام کی موجودگی میں مایوسی کا کیا سوال! مایوس تو وہ ہو جو یہ سمجھے کہ اب اس پیغام میں اس کی صلاحیت نہیں رہی کہ یہ کسی قوم کو از سرِ نو زندگی عطا کر سکے۔ اس نے جب (بزبانِ حضرت یعقوبؑ کہا تھا کہ) اِنَّهٗ لَا يَايْئَسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ (۱۲/۸۷) تو اس سے یہی مقصود تھا۔ ہم مایوس اس لئے ہو جاتے ہیں کہ

(۱) یا تو ہمیں قرآن کی ابدی صداقتوں پر یقین نہیں رہتا۔ یا

(۲) ہم کامیابی اور ناکامی کو کسی خاص خطۂ زمین تک محدود، یا خاص قوم سے وابستہ کر دیتے ہیں۔ اور یا

(۳) ہم چاہتے ہیں کہ ہماری کوششوں کا نتیجہ ہماری زندگی میں محسوس شکل میں سامنے آجائے۔"

شقِ اوّل کے سلسلہ میں واضح ہے کہ میرے لئے قرآن کی ابدیّت کے متعلق کسی قسم کے شک و شبہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میری تو زندگی اسی یقین کے سہارے قائم ہے۔ لہٰذا، میں باقی دو شقوں کے متعلق ہی بات کروں گا۔

قرآن کا پیغام جس طرح کسی خاص زمانے تک محدود نہیں، اسی طرح وہ کسی خاص خطۂ زمین میں بھی مقید، یا کسی خاص قوم تک محصور نہیں۔ وہ ذکر للعالمین ہے۔ تمام نوعِ انسان کے لئے، ہمیشہ کے لئے پیغامِ حیات —— میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ بیشتر اقوامِ عالم، قرآنی پیغام کے قریب آ رہی ہیں۔ قرآن نے اِلّاَ کی منزل تک پہنچنے کے لئے لاَ کو مقدم شرط قرار دیا ہے۔ لاَ کے معنی ہیں تمام غیر قرآنی تصورات و نظریات سے چھٹکارا حاصل کر لینا۔ دنیا کی کم و بیش تمام مہذب قومیں قدامت پرستی کی اندھی تقلید سے نجات حاصل کر چکی ہیں، لیکن چونکہ ان کے سامنے زندگی کی کوئی مثبت اقدار نہیں اس لئے وہ لاَ کے بحران سے آگے نہیں بڑھ سکیں۔ کچھ عرصہ تک تو وہ اس نجات کے جشن منانے میں مگن رہیں لیکن اس کے بعد انہوں نے محسوس کرنا شروع کر دیا ہے کہ زندگی خلاء میں نہیں گزاری جا سکتی۔ اس وقت اقوامِ مغرب کا عالمگیر اضطراب اسی شدتِ احساس کا دیوانہ وار مظاہرہ ہے۔ انہیں زندگی کی مثبت بنیادوں کی تلاش ہے اور وہ قرآن کے سوا کہیں نہیں مل سکتیں۔ میں یہ محض بر بنائے عقیدت نہیں کہہ رہا۔ علیٰ وجہ البصیرت کہہ رہا ہوں۔ اس نتیجہ پر میں، اقوامِ مغرب کے افکار کے مطالعہ ہی سے نہیں پہنچا، وہاں کے مفکرین اور ریسرچ سکالرز جو مجھے ملنے آتے ہیں، ان سے بالمشافہ گفتگو کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہوں۔ اس لئے میں قرآن کی ابدی صداقت یا نوعِ انسان کے مستقبل کی طرف سے کس طرح مایوس ہو سکتا ہوں؟ باقی رہا خطۂ زمین کا سوال، سو اس میں شبہ نہیں کہ جس سرزمین میں انسان پیدا ہوتا ہے، جی چاہتا ہے کہ وہ سرزمین سب سے پہلے قرآنی روشنی سے منور ہو —— ہر رسول نے اپنی تبلیغ کا آغاز اپنی زاد بوم ہی سے کیا تھا۔ میری بھی یہ آرزو ہے کہ یہ خطۂ زمین، جسے ہم نے حاصل ہی اس مقصد کے لئے کیا تھا، سب سے پہلے قرآنی اقدار کا گہوارہ بنے۔ لیکن اگر ہم اس خوش بختی کے لئے آمادہ نہیں تو یہ آفتاب کسی اور سرزمین پر طلوع ہو جائے گا۔

لہٰذا اس میں مایوسی کی کون سی بات ہے۔

اگر کھو گیا اِک نشیمن تو کیا غم　　مقاماتِ آہ و فغاں اور بھی ہیں

جہاں تک خود سرزمینِ پاکستان کا تعلق ہے، میں تو یہاں بھی کچھ مشکل نہیں دیکھ رہا۔ جیسا کہ میں شروع سے کہتا چلا آ رہا ہوں، اس کا آسان طریقہ یہ ہے کہ ہم اپنی نئی نسل کی تعلیم کا ایسا انتظام کریں کہ قرآنِ کریم کی راہ نمائی ان کے قلب کی گہرائیوں میں پیوست ہو جائے۔ نظامِ تعلیم میں اس تبدیلی کے لئے ہمیں پوری پوری آزادی حاصل ہے۔ اس میں ہم کسی طرح بھی مجبور نہیں۔ اور جب ہم اس باب میں مجبور نہیں تو ہم مایوس کیوں ہوں؟ قرآنِ کریم نے اپنے پیغام کے اوّلیں صفحات پر ابلیس و آدم کی داستان تمثیلی طور پر بیان کی ہے۔ اس داستان کی لم یہ ہے کہ آدم کو اپنی غلطی کا احساس ہوا تو اس نے اس کا اعتراف کیا کہ مجھ سے غلطی ہوئی۔ میں اس کا ذمہ دار ہوں۔ آئندہ محتاط رہوں گا۔ اس پر باز آفرینی کے دروازے کھل گئے۔ ابلیس سے پوچھا گیا کہ تو نے ایسا کیوں کیا تو اس نے کہا کہ میں مجبور ہوں، صاحبِ اختیار نہیں۔ اس لئے میں اپنی غلطی کا ذمہ دار نہیں۔ اس سے کہا گیا کہ تو اپنے آپ کو مجبور سمجھتا ہے تو تجھ پر زندگی کے راستے کشادہ نہیں ہو سکتے۔ ابدی مایوسی تیرا مقدر ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ مایوس وہ ہوتا ہے جو اپنے آپ کو مجبور سمجھنے لگ جائے۔

پاکستان کا مستقبل

لہٰذا، عزیزانِ من! میں خطۂ پاکستان کے مستقبل کی طرف سے بھی مایوس نہیں۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ یہ جو ہمارے حالات اس درجہ پریشان کُن ہو گئے ہیں تو یہ بھی ہمارے حق میں بہتری ہے۔ اگر ابتری اتنی شدّت اختیار نہ کر لیتی تو ہمیں اپنی غلطیوں کا احساس ہی نہ ہوتا۔ درد کی شدّت اپنے مرض کی طرف سے غافل بیمار کو علاج کے لئے مجبور کر دیا کرتی ہے۔

اس کے بعد تیسری شق کو لیجئے تو انسان کی یہ فطری خواہش ہوتی ہے کہ وہ اپنی آرزؤں کے منتہیٰ کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لے۔ جسے اپنی زندگی میں اپنی کوششیں ثمر بار ہوتی دکھائی نہ دیں، وہ مایوس ہو جاتا ہے۔ لیکن قرآنِ کریم تسلسلِ حیات کے عقیدہ سے اس قسم کی مایوسی کو بھی انسان کے پاس پھٹکنے نہیں دیتا۔ اسی قسم کی آرزو حضور نبی اکرمؐ کے سینۂ اطہر میں بھی ابھری تھی جب آپ نے (بزبانِ حال) کہا تھا کہ بارِالٰہا! میری ساری زندگی اسی تگ و تاز میں گذر جائے گی، یا میں اپنی کوششوں کو ثمر بار ہوتے بھی دیکھ لوں گا۔ تو اس کا جواب ملا تھا کہ وَ اِنْ مَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِىْ نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ تمہیں اس سے غرض نہیں ہونی چاہیئے کہ تمہاری کوششوں کا نتیجہ تمہاری زندگی میں سامنے آ جائے گا۔ یا اس کے بعد فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ وَ عَلَيْنَا الْحِسَابُ (۱۳/۴۰)۔ تیرا کام یہ ہے کہ تو اس پیغام کو عام کرتا جائے۔ اس کا حساب لگانا ہمارے ذمے ہے کہ یہ تخم ریزی بار آور کب ہوگی۔ تمہیں اس باب میں متردّد نہیں ہونا چاہیئے، نہ ہی مایوس۔ مایوس وہ ہو جو سمجھے کہ موت سے اس کی زندگی کا خاتمہ ہو جائے گا۔ جسے تسلسلِ حیات پر ایمان ہو، وہ مایوس کیوں ہو۔ اقبالؒ کے الفاظ میں:-

قناعت نہ کر عالمِ رنگ و بو پر　　چمن اور بھی آشیاں اور بھی ہیں

(اس کا باقی حصّہ صفحہ ۳۲ پر ملاحظہ ہو)

از شاہد عادل

مودودی صاحب اور انسانی خلافت کا نظریہ

مودودی صاحب کی تفسیر تفہیم القرآن پر طلوع اسلام کے صفحات میں آٹھ قسطوں پر مشتمل راقم کا مفصل تبصرہ شائع ہو چکا ہے۔ اس تبصرے میں دکھایا گیا تھا کہ بہت سے اہم مسائل کے بارے میں مودودی صاحب نے جو تحقیقات پیش کی ہیں وہ نہ صرف یہ کہ قرآن کے خلاف ہیں بلکہ حدیث و فقہ سے بھی ان کی نفی ہوتی ہے، آج ایک ایسے ہی اہم مسئلے کے بارے میں تفہیم القرآن سے اُن کی تحقیق پیش کر کے، اسلامی تعلیمات کی روشنی میں اس کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔ یہ مسئلہ ہے انسان کو خدا کا خلیفہ سمجھنا۔ اس بارے میں وہ سورۃ الانعام کی آیت نمبر ۱۶۵ وَ هُوَ الَّذِیْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ کی تفسیر بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"اس فقرہ میں تین حقیقتیں بیان کی گئی ہیں، ایک یہ کہ تمام انسان، زمین میں خدا کا خلیفہ ہیں۔ اس معنی میں کہ خدا نے اپنی مملوکات میں بہت سی چیزیں، ان کی امانت میں دی ہیں اور ان پر تصرف کے اختیارات بخشے ہیں"۔

دوسرے یہ کہ ان خلیفوں میں مراتب کا فرق بھی، خدا ہی نے رکھا ہے، کسی کی امانت کا دائرہ وسیع ہے اور کسی کا محدود۔ کسی کو زیادہ چیزوں پر تصرف کے اختیارات دیئے ہیں اور کسی کو کم چیزوں پر۔

تیسرے یہ کہ یہ سب کچھ دراصل، امتحان کا سامان ہے۔ پوری زندگی ایک امتحان گاہ ہے"۔

(تفہیم القرآن جلد اوّل صفحہ ۶۰۶ انیسواں ایڈیشن ۱۹۸۱ء)

تفہیم کی اسی جلد میں وہ خلیفہ کے معنی یہ بیان کرتے ہیں:۔

"خلیفہ وہ ہے جو کسی کی مِلک میں اس کے تفویض کردہ اختیارات، اس کے نائب کی حیثیت سے استعمال کرے۔ خلیفہ مالک نہیں ہوتا، بلکہ اصل مالک کا نائب ہوتا ہے۔ اس کے اختیارات ذاتی نہیں ہوتے، بلکہ مالک کے عطا کردہ ہوتے ہیں، وہ اپنے منشاء کے مطابق کام کرنے کا حق نہیں رکھتا، بلکہ اس کا کام مالک کے منشاء کو پورا کرنا ہوتا ہے"۔

(ایضاً صفحہ ۶۲ نوٹ نمبر ۳۸)

اس تشریح کے بعد نوٹ نمبر ۳۹، ۴۰، ۴۱ اور ۴۵ اور آدم کے خلیفۃ اللہ ہونے کی بحث فرمائی ہے۔

مودودی صاحب نے خلیفہ کی جو تعریف بیان کی ہے، وہ ان کی خود ساختہ معلوم ہوتی ہے۔

عربی زبان میں لفظ خلیفہ کے لغوی معنی جانشین اور قائم مقام کے ہوتے ہیں۔ ابتدائے اسلام میں یہ لفظ اپنے انہی معنوں میں استعمال ہوتا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد جب حضرت ابوبکر صدیقؓ آپ کے خلیفہ یعنی جانشین مقرر ہوئے، تو کسی بدوی نے آپ کو غلطی سے خلیفۃ اللہ کہہ دیا۔ آپ نے فوراً اس کی اصلاح فرمائی کہ بھائی میں اللہ کا خلیفہ نہیں بلکہ رسول اللہؐ کا خلیفہ ہوں۔

(احکام السلطانیہ از علامہ الماوردی صفحہ ۱۴ عربی ایڈیشن)

قرآن مجید کی سورۃ البقرہ کی آیت ۳۰ میں جو خلیفہ کا ذکر ہے تو کچھ لوگوں نے اسے بغیر کسی دلیل کے خدا کا خلیفہ قرار دیا۔ اب اگر اس لفظ کے لغوی معنوں کو سامنے رکھا جائے تو پھر خلیفہ کو خدا کا جانشین یا قائم مقام تصور کرنا پڑتا ہے، اس لئے اس کے مرادی معنی نائب کئے گئے۔ حدیث شریف میں اس مطلب کی تائید میں ایک اشارہ تک نہیں ملتا۔ بلکہ حضرت ابوبکرؓ نے جو اس کی عملی تشریح فرمائی، اس کی روشنی میں بھی اس مرادی معنے کی گنجائش نہیں۔

لفظ خلیفہ کا مادہ خلفۃ ہے۔ جس کے لغوی معنی درختوں کے وہ پتے ہیں، جو پہلے پتوں کے گر جانے کے بعد دوبارہ لگتے ہیں۔ اس لحاظ سے اس کے صحیح معنی جانشین کے ہیں، تاہم اس اصل کی روشنی میں امام راغب اصفہانی نے مفردات القرآن میں اس کے یہ مفصل معنی بیان کئے ہیں۔

"لفظ خلیفہ کا مادہ خلف ہے جس کے معنی جانشین کے ہیں اور خلافت سے مراد یہ ہے کہ کسی کا جانشین بننا یا اس کی نیابت کرنا۔ اس کی عدم موجودگی، موت یا نااہلی کی صورت میں"۔

چنانچہ اگر خلیفہ کے مرادی معنی نائب کے لئے جائیں، تو پھر بھی انسان کو خدا کا خلیفہ قرار نہیں دیا جاسکتا کیونکہ اللہ تعالیٰ ہر جگہ موجود اور ہر قسم کے نقائص سے مبرا ہے، اس لئے اسے کسی وقت بھی اپنی نیابت کے لئے کسی کو مقرر کرنے کی ضرورت نہیں، اور نہ ہی کسی انسان کو اس نے اپنے اختیارات تفویض کئے ہیں۔

لفظ خلیفہ قرآن مجید میں متعدد مقامات پہ استعمال ہوا ہے ملاحظہ ہو سورۃ الاعراف آیات ۶۹-۷۴، اور ۱۴۲، اور سورۃ یونس آیت ۱۴۔ ان تمام مقامات پہ خلیفہ کا لفظ اپنے لغوی معنوں یعنی جانشین کے طور پہ استعمال ہوا، لیکن کہیں بھی یہ نائب کے طور پہ استعمال نہیں ہوا۔ امام فخرالدین رازی نے حضرت ابن عباسؓ کی سند سے یہ روایت بیان کی ہے۔ کہ جب اللہ تعالیٰ نے، جنوں کو زمین سے نکال دیا، تو حضرت آدم اور ان کی اولاد کو اس پہلی مخلوق کے جانشین کے طور پہ زمین میں آباد کیا۔ علامہ الوسی نے اسی حقیقت کو دوسرے لفظوں میں بیان کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ انسان، جنوں، شیطان یا فرشتوں کا اس دنیا میں

جانشین ہے۔ (تفسیر روح المعانی جلد اول صفحہ ۲۲۰)

اس کی تائید سورت الحجر کی آیت ۲۷ سے بھی ہوتی ہے جس میں یہ فرمایا گیا ہے، کہ انسان سے پہلے ہم نے جنوں کو گرم آگ سے پیدا کیا تھا۔

ان تمام تفصیلات کو سامنے رکھتے ہوئے، علامہ الماوردی فرماتے ہیں، کہ جمہور علمائے اسلام کا اس امر پہ اتفاق ہے، کہ جو شخص اس نظریے پہ عقیدہ رکھے کہ انسان خدا کا خلیفہ ہے وہ فاسق و فاجر ہے۔

(الاحکام السلطانیہ صفحہ ۱۵ عربی ایڈیشن)

امام ابن تیمیہ سے جب اس بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا کہ ایسا نظریہ رکھنا کفر اور شرک ہے، اپنے مشہور فتاویٰ، الموسوم بہ الفتاوی الکبریٰ، کی جلد دوم کے صفحہ ۳۵۵ پر انہوں نے اس نظریے پہ بڑی تفصیل سے بحث کر کے اسے خالص شرک قرار دیا ہے۔

لیکن حیرت کی بات ہے کہ جس نظریے کو امت مسلمہ کے علماء کی اکثریت فسق و فجور اور امام ابن تیمیہ شرک اور کفر قرار دیتے ہیں، مودودی صاحب بغیر کسی دلیل کے اسے اسلامی عقیدہ قرار دیتے ہیں۔ اگر اس بارے میں ان کے پاس قرآن و حدیث سے کوئی دلائل تھے، تو ان کے لئے لازمی تھا کہ وہ انہیں سامنے لاتے اور سلف صالحین نے اس بارے میں جو فیصلہ دیا تھا اور جسے اوپر تفصیل سے نقل کیا جا چکا ہے، اسے رد کرتے۔ مگر انہوں نے ایسا کرنے کی بجائے خلیفہ کی خود ساختہ تعریف اپنی طرف سے پیش کر کے خالص شرکیہ عقیدہ کو اسلامی تعلیمات بنا کر پیش کر دیا۔

ان تفصیلات سے یہ حقیقت واضح ہو کر سامنے آ جاتی ہے کہ انسان کو خدا کا خلیفہ قرار دینا، اسلامی تعلیمات کے خلاف ہے لیکن حیرت کی بات ہے کہ تفہیم القرآن کے بیس سے زیادہ ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں لیکن کسی اہل علم نے اس میں پیش کردہ، اس خلافِ اسلام عقیدے کی نشاندہی نہیں کی۔ اگر اہلِ علم اس کتاب کا مطالعہ نہیں کرتے تو مودودی صاحب کے پیرو کار تو ضرور کرتے ہوں گے۔ کیا ان میں ایک بھی اہل علم موجود نہیں جو اس خلافِ اسلام نظریہ کو تفہیم القرآن سے خارج کرنے پہ زور دیتا۔

خریدار صاحبان متوجہ ہوں

خط و کتابت کرتے وقت اپنا خریداری نمبر ضرور لکھیں۔

(۱) بسا اوقات ادارہ ہذا کے نام جو منی آرڈر موصول ہوتے ہیں ان کے کوپنز (COUPONS) پر خریدار کا مکمل پتہ نہیں لکھا ہوا ہوتا۔ اس کا خاص خیال رکھا جائے تاکہ تعمیل میں بلاوجہ تاخیر نہ ہو۔

ناظم ادارہ طلوعِ اسلام

بسلسلۂ داغوں کی بہار

★ مدت سے سوچ رہی تھی کہ موقر رسالہ طلوع اسلام کی وساطت سے میں بھی باباجی کے حضور اپنے جذبات و تاثرات کا نذرانۂ عقیدت پیش کروں۔ لیکن ہر دفعہ میرا قلم انہیں مرحوم لکھتے ہوئے لرز جاتا۔ ابھی جب کہ ان کی جدائی کے بعد پہلی عید آرہی ہے تو یہ سوچ کر کہ پیارے باباجی پہلے کی طرح اس عید پر بھی میرا انتظار کریں گے تو مناسب سمجھا کہ انکی زندگی کی متاعِ گراں بہا یعنی رسالہ طلوعِ اسلام کی وساطت سے انہیں عید مبارک پہنچا دوں۔

مجھے یہ اعزاز حاصل ہے کہ بقول باباجی! سب سے پہلے میں نے انہیں باباجی کہا اور پھر ساری دنیا انہیں باباجی کہنے لگ گئی۔

جب سے میں نے خانۂ پرویز میں آنکھ کھولی میں نے ہمیشہ انہیں پاکستان کی خوشحالی اور اسلام کی سربلندی کے لئے منہمک و مضطرب پایا۔ اس مقصدِ جلیلہ کے حصول کے لئے انہوں نے طلوعِ اسلام کی بنیاد رکھی اور پھر اس شجرِ طیب کی آبیاری کے لئے تادمِ حیات شب و روز سرگرداں رہے۔

ابتداءً ان کے ہم نواؤں کی تعداد بہت قلیل تھی لیکن دیکھتے ہی دیکھتے یَدۡخُلُوۡنَ فِیۡ دِیۡنِ اللّٰہِ اَفۡوَاجًا کے مصداق، ان میں معتد بہ اضافہ ہوتا گیا۔ انہیں کتنی سنگلاخ گھاٹیوں اور دشوار گزار راستوں سے گزرنا پڑا اور کن کن مصائب و مشکلات کا سامنا کرنا پڑا، یہ ہے الگ داستان لیکن ؎

نہ ان بادِ مخالف سے تو گھبرا اے عقاب
یہ تو چلتی ہے تجھے اونچا اڑانے کے لئے

وہ تو لَاخَوۡفٌ عَلَیۡهِمۡ وَلَا هُمۡ یَحۡزَنُوۡنَ کی سراپا تصویر تھے۔ ان تیز و تند ہواؤں کا دلوانہ وار مقابلہ کرتے رہے اور طلوعِ اسلام کا دیا ہاتھ میں اٹھائے تمام تنگ و تاریک راستوں کو منور کرتے رہے اور کاروانِ ملت کو اس مقام پر لے آئے کہ وہ سوچنے لگ گئے کہ

یہی دیا جلے گا تو روشنی ہو گی۔

مجھے یاد ہے ایک دفعہ میں نے ان کی اس کوہ کنی اور نامساعد حالات کے بارے میں پوچھا کہ آیا یہ سب ایک عام انسان کے بس کی بات ہے۔ تو انہوں نے اپنے منفرد اور فصیح و بلیغ انداز میں سمجھایا کہ "میں بھی ایک عام انسان ہوں لیکن اگر انسان کے سامنے مقصد عظیم ہو اور جذبہ سچا ہو تو

فطرت کی سب قوتیں اس کے سامنے سجدہ ریز ہو جاتی ہیں"۔

بابا جی کے متعلق عام طور پر یہ تاثر ہے کہ وہ بس ایک نابغۂ روزگار مصنف اور مفکّر تھے در اصل عملی زندگی میں بھی وہ ایک اعلیٰ درجہ کے حقیقت پسند انسان تھے۔

فوجی ملازمت کی وجہ سے اگر ہماری تبدیلی جگہ جگہ ہوتی رہتی، جہاں کہیں بھی ہم گئے انہوں نے شرفِ خدمت بخشا۔ نئی جگہ کے متعلق ان کی معلومات وہاں کے باسیوں سے بھی زیادہ ہوتیں جن راستے سے وہ ایک دفعہ گزر جاتے۔ اس میں خواہ کتنے ہی پیچ وخم ہوں وہ پھر کبھی نہ بھولتے۔ ایک دفعہ میرے استفسار پر انہوں نے فرمایا کہ زندگی کے ہر گوشے میں دلچسپی لینا اور اسے بھرپور طریقے سے گزارنا سیکھو تو راستے کے پیچ وخم تو کیا زندگی کے بھول بھلیاں بھی آسان ہو جائیں گی۔

میں اگرچہ ان کی حقیقی بیٹی نہیں ہوں در اصل انہوں نے مجھے اپنے بھائی سے لیکر پالا تھا۔ لیکن ان کی محبت اور شفقت کا یہ عالم تھا کہ مدتوں مجھے یہ پتہ ہی نہیں چلا کہ میں ان کی حقیقی بیٹی نہیں ہوں میرے ساتھ وہ کھلونوں سے کھیلتے اور مجھے کبھی تنہائی کا احساس نہ ہونے دیتے۔

بچوں کے ساتھ ان کا طرزِ عمل انتہائی مشفقانہ، پدرانہ بلکہ دوستانہ ہوتا تھا۔ وہ انہی کی سطح پر ان سے ہم کلام ہوتے۔ بچوں کو ہمیشہ کل کا معمار تصور کرتے تھے۔

میں جب بھی بابا جی کے پاس آتی وہ ہمیشہ بچوں کو ساتھ لے کر مارکیٹ جاتے اور اپنے ہاتھوں سے ان کے لئے تحائف خریدتے۔ جب بچے امتحانات میں کامیابی حاصل کرتے تو انکی حوصلہ افزائی فرماتے اور ان کے حسبِ منشا انعامات دیتے۔

خانگی امور میں وہ انتہائی متوازن و معتدل شخصیت کے حامل تھے۔ ہر عید یا اہم تقریب پر ان کا یہ اصرار ہوتا کہ میں وہ دن ان کے پاس گزاروں۔ یہ پہلی عید ہے کہ بابا جی کا اپنی "گکو جی" کے لئے کوئی پیغام نہیں آیا اور مجھے یقین ہو چلا ہے کہ پیارے بابا جی کہیں دور چلے گئے ہیں۔ اپنے خالقِ حقیقی کے پاس! اس لئے کہ كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ

لیکن وہ زندۂ جاوید ہیں۔ اپنی تعلیمات اور فرمودات کی شکل میں کہ وہ ہمیشہ ہمارے لئے مشعلِ راہ ہوں گی۔

(بابا جی کی "گکو جی" نجمہ صفدر)

★ ۲۹ ستمبر کو بابا جی نے مجھے پدرانہ شفقت سے بلایا اور باجی نجمہ کے پاس سیالکوٹ جانے کو کہا۔ اس وقت وہ بالکل ہشاش بشاش اور خوشگوار موڈ میں تھے۔ میری واپسی ۹ اکتوبر کو ہوئی تو بابا جی کو خلافِ معمول بستر پر بیٹھے پایا! حیرانگی اور تشویش کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ طبیعت کا حال پوچھا! تو انہوں نے نہایت مشفقانہ انداز میں فرمایا کہ بیٹا تشویش کی کوئی بات نہیں، بس بازو اور ٹانگ میں تکلیف ہے جو کہ بوجھ نہیں اٹھا پاتی۔ بہر حال علاج تسلی بخش طریقہ

سے جاری ہے مجھے اس سے اطمینان تو ہو گیا! لیکن کیا معلوم تھا کہ یہ ذرا سی تکلیف کتنے المناک سانحہ کی پیش خیمہ ثابت ہو گی۔ اس وقت تقریباً شام ہو چکی تھی اس وقت سے آخر دم تک (وہ لمحہ بھی میرے حصے میں آیا جب باباجی نے آخری ہچکی اس بندۂ ناچیز کے ہاتھوں میں لی) میں ہر وقت باباجی کے پاس رہ کر ان کی خدمت میں مصروف رہا۔ اگرچہ قبل ازیں بھی میں اسی گھر میں رہتا اور اپنے اس عظیم محسن کی نوازشات سے مستفیض ہوتا رہتا تھا، لیکن ان ایام کے صدقہ میں جو فیوض و برکات حاصل کیں وہ میری زندگی کا بیش بہا سرمایہ ہیں۔

اپنی پیرانہ سالی اور ایک طویل عرصہ تک بستر علالت پر فراش رہنے کے باوجود انہوں نے بے مثال عزم و استقامت اور جرأت و ہمت کا مظاہرہ کیا۔ آپ ہر عیادت کرنے والے کے سامنے خندہ پیشانی اور شگفتہ انداز میں گفتگو فرماتے، اس پہ ہر کوئی مطمئن ہو کر جاتا۔

دن کے اوقات میں وہ اپنے آپ کو نسبتاً بہتر محسوس کرتے لیکن رات کو کم خوابی کی وجہ سے اکثر بے چین رہتے۔ اس اثنا میں میں انہیں دباتا رہتا اور وہ کچھ دیر کے لئے سکون کی نیند لے لیتے۔ بسا اوقات وہ پوری پوری رات مجھ سے محوِ گفتگو رہتے اور میں ان کی خدمت کرتا رہتا۔ آخری لمحہ تک ان کے مخصوص اسلوبِ بیان کے حسن اور منطقی انداز میں ذرہ بھر فرق نہیں آیا۔ نقاہت کے باوجود ان کی گفتگو میں اثر انگیزی کا یہ عالم تھا کہ وہ باتیں جو بڑی بڑی ضخیم کتابوں کی ورق گردانی سے بھی حاصل نہ کر سکتا تھا وہ چند جملوں میں ذہن نشین کرا دیتے۔ انہی لمحات کی بدولت میری زندگی میں ایک عظیم انقلاب برپا ہو گیا۔ اور ان کے یہ فرمودات اور ارشادات ہی اب میری زندگی کا زادِ راہ ہیں۔ بقولِ اقبالؔ

یک زمانہ صحبتِ با اولیا بہتر از صد سالہ طاعت بے ریا

تحریکِ طلوعِ اسلام کے مستقبل کے بارے میں اس دوران جب بھی بات ہوتی تو انکی آنکھیں نورِ ایمانی سے چمک اٹھتیں اور کہتے کہ ربِّ عظیم کا مجھ پر لطف و کرم ہے کہ میں حسبِ استطاعت اپنی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہو گیا ہوں اور پر امید ہوں کہ

پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا

اور کارواں اپنی منزل کی طرف رواں دواں رہے گا

محترم باباجی کی ہمہ جہت شخصیت کے حضور ایک دنیا سرنگوں رہتی تھی۔ وہ علم و فن کی ایک مکمل درسگاہ تھے۔ اس میدان میں نہ وہ محتاجِ اصلاح تھے اور نہ کسی کوچہ سے کسی معاملہ میں مشورہ کی گداگری کرتے تھے بلکہ بڑے بڑے صاحبِ علم آ کر اپنی گتھیاں سلجھا کر جاتے۔ آخر میں یہ ضرور کہوں گا کہ باباجیؒ کی کسی بات کو اپنے ساتھ منسوب کرنا گویا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہو گا۔

اسوگوار سلیم یہ وہنہ (باباجی کا بھولا)

★ باباجی کی ناگہانی وفات کا پڑھ کر بہت صدمہ ہوا۔ اللہ تعالیٰ سے ہم سب لوگ دعاگو ہیں کہ مرحوم کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے (آمین)
باباجی کی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں۔ ہم سب کو ہمت اور حوصلہ سے باباجی مرحوم کے مشن کو آگے بڑھانا چاہیئے۔ ہمارے لائق کوئی بھی خدمت ہو تحریر کریں۔ والسلام

(شفیق الرحمان بھنی ولیہ)

★ آہ آج گلستانِ مصطفےٰ کی بلبل ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئی۔ مرحوم نے جو خدمات عالم اسلام اور دینِ خداوندی کے لئے سرانجام دی ہیں۔ ناقابلِ فراموش ہیں۔ ان کی کتب پڑھ کر انسان خیالات میں مستغرق ہو کر سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ میں مسلمان ہوں بھی یا نہیں۔ جب میں نے مطالعہ کیا بدعات سے سخت متنفر ہوا اور ضمیر کو سکون ملا جیسے آج ہی اسلام لایا ہوں۔ میرے محترمو میں آپ کے غم میں برابر کا شریک ہوں۔
اب اللہ تعالیٰ سے دعاگو ہوں کہ ربّ العزت مرحوم پر اپنی رحمتیں نازل فرمائے اور محمدؐ کا قرب مرحوم کو نصیب ہو۔ والسلام

(ڈاکٹر قدیر احمد چوہدری۔ جرمنی)

★ جناب پرویز صاحب کی وفات سے ایسا خلا پیدا ہوا ہے، جو کبھی پُر نہیں ہو سکتا۔ میرا یہ پختہ خیال ہے کہ گذشتہ ۱۲ سال میں تاریخ نے ایسے چند ہی گنتی کے دانشور اور عالم پیدا کئے ہیں جو صحیح قرآنی معاشرے کے قیام کے لئے بے باکی سے لوگوں کو سمجھاتے رہے۔
میری دعا ہے کہ اس بڑے مفکرِ قرآن کو اللہ تعالیٰ جنت الفردوس میں جگہ دے اور ہم سب کو ان کے نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق دے۔ آمین۔

(غلام احمد بال ڈھوک کھبہ راولپنڈی)

لاہور کے سامعینِ درس متوجہ ہوں

درس قرآن بذریعہ وی سی آر (V-C-R) ہر جمعہ کی صبح ۸½ بجے 25/B گلبرگ II (لاہور) میں ہوتا ہے۔

ناظم ادارہ طلوع اسلام

افکارِ پرویزؒ کی صدی (مسلسل)

۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو بالآخر پاکستان کا قیام عمل میں آیا۔ اس روز پاکستان میں صدیوں کی غلامی سے بازیابی کے بعد خوشی کے جشن منائے گئے۔ ۱۸ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان میں آزادی کی پہلی عید منائی گئی۔ آزادی کی خوشیوں کا شور ابھی فضا میں گونج ہی رہا تھا کہ منافقین (نوم پرست مسلمانوں) کا طائفہ جو کسی نہ کسی طرح تپ دق کے جراثیم کی طرح ہماری ہڈیوں کے گودے کے اندر تک پہنچ چکا تھا، اب ناصح مشفق کے لباس میں دشمنوں کی سازشوں کو کامیاب بنانے میں مصروف ہوگیا۔ ان غدارانِ ملک و ملت کا منافق گروہ اس میں پیش پیش تھا جو شروع ہی سے ملت کے عزائم و مقاصد کا دشمن رہا تھا۔ اور یہاں پہنچ کر اس نے اپنے آقایانِ نعمت کا حق نمک ادا کرنا شروع کر دیا۔ اب انہوں نے ایک دوسرا نقاب اوڑھا اور ملت کی قیادت میں کیڑے ڈالنے شروع کر دیئے اور اس طرح پاکستان کے حامی بن کر بیٹھ گئے لیکن یہ حمائت بھی دراصل اس تخریب کیلئے تھی جس کی تبلیغ وہ اتنے عرصے تک کرتے چلے آئے تھے۔ انہوں نے نہایت غم خوارانہ انداز میں ٹھنڈی آہیں بھر بھر کر کہنا شروع کیا کہ اگر مسلمان ہماری مان لیتے تو مصیبتوں کے یہ پہاڑ ان پر کیوں ٹوٹتے۔ اب ان مصیبتوں اور غلطیوں کا علاج یہ ہے کہ ملک کی قیادت، حاملین شریعت کے ہاتھوں میں دے دی جائے اور حاملین شریعت میں ان کا مقام سب سے زیادہ بلند ہے کیونکہ وہ مزاج شناسِ رسول ہیں۔ یہ اور اس قسم کے دوسرے عناصر کی تخریب پسندیوں کو دیکھتے ہوئے ۱۴ اگست ۱۹۴۸ء کو محترم لیاقت علی خاں صاحب، وزیراعظم پاکستان نے ریڈیو پاکستان کراچی سے تقریر کرتے ہوئے فرمایا:۔

اہم ترین مشکل جو ہمیں پیش آ رہی ہے، ایسے عناصر کی موجودگی ہے جن کا مقصد افتراق پیدا کرنا ہے۔ ان خود غرض اور گمراہوں نے نزاکتِ وقت کو بالکل نظر انداز کر دیا ہے۔ اور ایسی فضا پیدا کرنے کے درپے ہوگئے ہیں جو نوخیز مملکتِ پاکستان کو اگر ختم نہیں کر سکی تو بڑی حد تک درماندہ ضرور کر دے گی۔ ایسے لوگ واقعی پاکستان کے بدترین دشمن ہیں۔ یاد رکھئے کہ ہم میں سے وہ لوگ جو اس طرح درپئے تخریب ہیں، انکی ہمدردیاں بیرونی لوگوں کے خطرناک عزائم کی بہ نسبت ہمارے لئے خطرناک

تر ہیں۔ لہٰذا میں پاکستانیوں سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ ایسے لوگوں کی نقصان رساں سرگرمیوں سے ہوشیار رہیں۔

موقع کی اس نزاکت اور تخریبی قوتوں کے اس سیلاب کو روکنے کے لئے طلوع اسلام کو پھر اُسی طرح کمربستہ ہونا پڑا جس طرح تقسیم سے قبل قائداعظمؒ کے ہاتھ مضبوط کرنے اور حصولِ پاکستان کی جدوجہد کو کامیاب بنانے کے لئے دشمن کی اس منظم فوج کا مقابلہ کرنا پڑا تھا جو جبہ و دستار میں لپٹے ہوئے لات و منات کی طرح قال اللہ اور قال الرسول کا لبادہ اوڑھ کر، خدا اور تقاضائے ایمان کو دشمن کے ہاتھوں فروخت کرکے، دشمن کے آلۂ کار کی حیثیت سے آگے بڑھ رہی تھی۔

اس نازک موڑ پر طلوع اسلام پھر قرآنی بصیرت کی قوتوں سے مسلح ہو کر میدان میں اُترا اور اس نے ان چھپے دشمنوں کو کھلے بندوں للکارا۔ اور ساتھ ہی عوام کے قلب و نگاہ کی تربیت کرتے ہوئے منزلِ مقصود کی طرف بڑھنے کے لئے صراطِ مستقیم کی واضح نشاندہی کی۔ یہ اس وقت سے آج تک مسلمانوں کی حیاتِ گم گشتہ اور اس کے چھپے ہوئے خزانوں سے اُسے روشناس کرانے کی مسلسل جدوجہد کر رہا ہے۔ طلوع اسلام زندگی کے حقائق پیش کرتا ہے۔ اس کی دعوت، تعینِ منزل (ایمان) اور حرکتِ پیہم (عمل) کی دعوت ہے۔ طلوع اسلام جس صراطِ مستقیم کی نشاندہی کرتا ہے وہ یہ ہے کہ اسلامی نظام کی بنیاد عقیدۂ توحید ہے جو ایک عبدِ مسلم کے فکر و نظر اور اعمال و احوال کے تمام گوشوں کو محیط ہے۔ توحید سے مفہوم یہ ہے کہ حاکمیت کا اقتدارِ اعلیٰ صرف خدا کو حاصل ہے یعنی انسان کو خواہ وہ ایک فرد ہو یا افراد کا مجموعہ، دوسرے انسانوں پر حکومت کرنے کا کوئی حق نہیں۔ قرآنی مملکت کے نظام میں حاکم اور محکوم کا تصور نہیں ہوتا۔ مملکت کا بنیادی فریضہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے۔ قرآن نے یہ فریضہ کسی خاص گروہ کا قرار نہیں دیا بلکہ ساری کی ساری اُمت کا قرار دیا ہے۔ اس فریضہ کی ادائیگی کے لئے تقسیمِ عمل کے اصول کے مطابق مختلف کام مختلف افراد کے سپرد کر دیئے جاتے ہیں یعنی قرآنی نظام کی خصوصیتِ کبریٰ یہ ہے کہ اس میں کوئی شخص کسی دوسرے شخص پر نہ کسی قسم کا کنٹرول یا حقِ حکومت رکھے نہ کسی دوسرے کا [illegible]ج ہو۔ اور اس طرح کوئی انسان کسی دوسرے انسان کی محکومی اور غلامی میں نہ رہے خواہ [illegible]ی ذہنی اور فکری ہو اور خواہ طبعی اور اقتصادی۔

۱۹۴۸ء

طلوعِ اسلام کا اجراء پاکستان کے دارالخلافہ کراچی سے طلوع اسلام کا جنوری فروری ۱۹۴۸ء کا مشترک پہلا شمارہ شائع ہوا۔ اس شمارہ کے سرورق پر علامہ اقبالؒ کی تصویر شائع ہوئی ہے یہ رسالہ ۱۳۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ ابتدائی صفحات میں محاذِ کشمیر

کے مجاہدین کو خراج تحسین پیش کیا گیا ہے اس کے بعد ہندوستان میں لاکھوں بے گناہ مسلم مرد اور خواتین کی فسادات میں شہادت پر خون کے آنسو بہائے گئے ہیں۔ ایک صفحہ پر انسانیت کی موت کے عنوان سے لٹے پٹے بے گھر بے در مہاجرین کے سرحد سے اکثر نہ مر جانے پر بے حس دولتمندوں کو غیرت دلانے کی سعی کی گئی ہے۔ پاکستانی مسلمانوں کو کچھ ہدایات کی ہیں اور حکومت پاکستان کو چند مشورے دیئے ہیں۔ پاکستان کی مجلس آئین ساز کے اراکین کو متنبہ کیا ہے اور لکھا ہے کہ اوروں کے نزدیک آزادی سے مفہوم فقط اس قدر ہے کہ وہ اپنے لئے قانون بنا سکیں لیکن مسلمانوں کے نزدیک آزادی سے صرف یہ مفہوم ہے کہ وہ اپنے خدا کے قانون کو رائج کر سکیں۔ اس لئے اگر آپ نے قانون ابدی کے علاوہ کوئی اور قانون منتخب کیا تو مسلمانوں کے نزدیک یہ آزادی نہیں ہوگی غلامی کی غلامی رہے گی اور مسلمانوں کا سیاسی شعور اب اتنا بیدار ہو چکا ہے کہ وہ غلامی کی لعنتی زندگی سے رستگاری حاصل کر سکے خواہ وہ غلامی اپنوں ہی کی کیوں نہ ہو۔ پس منظر کے عنوان سے ۱۹۳۸ء سے ۱۹۴۷ء تک کا ہندوستان کی سیاست کا جائزہ پیش کیا ہے۔ ادارہ طلوع اسلام کی طرف سے محترم پرویز صاحب نے جو سپاسنامہ قائداعظمؒ کو پیش کیا تھا اس کے حروف و نقوش نے طلوع اسلام کے اس شمارہ کو چار چاند لگا دیئے ہیں۔ "لمعات" میں ہندوستان میں بسنے والے کروڑوں مسلمانوں کے مستقبل کی حفاظت کے نازک مسئلہ پر حکومت سے فوری توجہ دینے کی درخواست کی گئی ہے۔ پاکستان کے مختلف صوبوں میں بسنے والے مسلمانوں کو متنبہ کیا ہے کہ وہ صوبائیت جیسی لعنت کو ہرگز اپنے درمیان نہ آنے دیں۔ دو ایک مضامین اور اسد ملتانی صاحب کی دو نظموں کے علاوہ تمام رسالہ محترم پرویز صاحب کا تحریر کردہ ہے۔

مارچ ۱۹۴۸ء

مارچ ۱۹۴۸ء کا طلوع اسلام ۱۱۲ صفحات پر مشتمل ہے "لمعات" میں نیشنلسٹ گاڈز کو خلاف قانون قرار دے دینے پر احتجاج کیا گیا ہے۔ کانگریسی مسلمان مثلاً عبدالماجد دریاآ[redacted] مدیر "صدق" کا بیان "گاندھی جی عقیدہ کے لحاظ سے نیم مسلمان ضرور تھے وہ خدا کی وحدان[redacted] اور سرورِ کائنات کے مشن پر اعتقاد رکھتے تھے۔ اور کلام مجید سے ان کو بے حد شغف تھا وہ اسلام کے اصول جمہوریت اور مساوات کے دلدادہ تھے" (جنگ $\frac{2}{48}$-16)۔ ایم اے حسنی صاحب کے بیان "مہاتما گاندھی، ایک بہت بڑا ہندو ہونے کے ساتھ ساتھ، اسلام کے نصب العین اور فلسفہ پر بھی پورے اترتے تھے۔" (اسٹیٹسمین ۵ فروری) عبدالرحمن صاحب کے بیان "اگر میں یہ عقیدہ نہ رکھتا کہ نبوت محمد رسول اللہ کے ساتھ ختم ہو گئی تو میں یقیناً گاندھی جی کو بیسویں صدی کا پیغمبر کہتا ...... ہندوستان ٹائمز ۱۶ فروری ۱۹۴۸ء)، میر مشتاق احمد صاحب کا بیان "گاندھی جی کی عظمت، مکان و زمان کی حدود سے ماورا ہے یہ محبت و سلامتی کا پیغمبر، اپنی عظمت میں بدھ، عیسٰی اور محمدؐ سے بھی بڑھ گیا ہے۔ (ہندوستان

شمارہ ۱۸ فروری ۱۹۴۸ء)، پر اپنے تاسف کا اظہار کرتے ہوئے محترم پرویز صاحب نے لکھا: "ہم نے جس طرح سینہ پر پتھر رکھ کر ان اقتباسات کو درج کیا ہے اس کا اندازہ آپ لگا سکتے ہیں، ہم نے اس بحث کو طنزاً نہیں چھیڑا اس سے ہمارے جگر کے ٹکڑے ہوگئے ہیں۔" سندھ سٹوڈنٹس فیڈریشن کے اس نعرہ پر کہ سندھ ہمارا ہے ان نوجوانوں سے اپیل کی ہے کہ وہ اس کوتاہ نگہی سے کام نہ لیں اب پورا پاکستان ہی ہم سب کا ہے۔ "تقسیم ہند کا آئینی پہلو" کے عنوان سے محترم پرویز صاحب نے ہندوستان کی سیاست کا بھرپور جائزہ پیش کیا ہے۔ "محاسبۂ نفس" کے عنوان سے محترم پرویز صاحب نے لکھا کہ ہمیں ہر قدم پر اپنا محاسبہ کرتے رہنا چاہیئے جو قوم اپنے اعمال کو میزان احتساب میں تولنے سے جھجکتی ہے اس کے حصہ میں قیام نہیں ہے لہٰذا زندہ یا زندگی کی آرزومند قوم کو اپنے محاسبہ نفس یا تنقید اعمال سے کبھی تسامح نہیں برتنا چاہیئے۔ اس مضمون میں موصوف نے حکومت کی چند غلطیوں کی نشاندہی کی ہے اور ان کے عواقب سے خبردار کیا ہے "باب الاسلام سندھ" کے عنوان سے محترم پرویز صاحب نے سندھ کی مقننہ کی سندھ سے کراچی کو علیحدہ کر کے مرکز کی تحویل میں دے دینے کی مخالفت کرنے پر اپنے تاسف کا اظہار کیا ہے۔ "پاکستان مجلس دستور ساز کے ارکان سے" کے عنوان پر پاکستان کے دستور کے سلسلہ میں بھانت بھانت کی بولیاں بولنے پر محترم پرویز صاحب نے ۲۵ جنوری ۴۸ء کو سیرت النبیؐ کے موقع پر قائداعظمؒ کی تقریر جس میں انہوں نے فرمایا تھا "میں تو سمجھ ہی نہیں سکا کہ لوگوں کو اس استفسار کی ضرورت کیوں پڑ رہی ہے کہ پاکستان کا آئین اسلامی ہوگا یا نہیں ..... اسلامی اصول تو ایسے ہیں جن کی نظیر دنیا میں کوئی بھی پیش نہیں کر سکتا۔ یہ اصول آج بھی اسی طرح کارآمد ہیں جس طرح آج سے تیرہ سو سال پیشتر تھے۔" (ڈان ۲۶/۱/۴۸)، کا حوالہ دیتے ہوئے اسلامی نظام کے بنیادی خط و خال پیش کیے ہیں اور ارکین دستور ساز کو اس کی روشنی میں دستور بنا [illegible] کی دعوت دی ہے۔ طلوع اسلام کے اسی شمارہ میں پرویز صاحب نے "دل بدل [illegible] تعلیم بدل جانے سے" کے عنوان سے تحریر فرمایا ہے کہ "قوم انسانوں کے ہجوم اور انبوہ کا نام نہیں ہوتا بلکہ یہ عبارت ہوتی ہے انسانوں کے اس مجموعہ سے جن میں یک دلی اور یک رنگی، ہم آہنگی اور ہم خیالی ہو۔ یک نگہی اور یک دلی اس صورت میں پیدا ہو سکتی ہے جب اس قوم کی تعلیم مشترک ہو تاکہ ان کے قلب و دماغ کی تعمیر ایک ہی نقشہ کے مطابق ہو اور ان کی ذہنی اور فکری صلاحیتیں ایک ہی قالب میں ڈھل کر باہر نکلیں۔ لہٰذا تعمیر پاکستان میں سب سے مقدم کام تعلیم کا ہے۔ اگر ہماری تعلیم صحیح نہج و اسلوب پر شروع ہو گئی تو سمجھ لیجیے کہ ہماری ملی عمارت کی بنیاد صحیح خطوط پر اٹھے گی۔ اور اگر اس کی طرف سے ایسا ہی تساہل و تغافل برتا گیا جیسا کہ ہم نے اس سے پہلے برتا ہے

تو انسانوں کا یہ منتشر مجموعہ" تا قیامت" قوم نہیں بن سکے گا۔
قارئین کرام! اس مقام پر اس دانائے راز" پرویز" کی دور رس نگاہ کا اندازہ لگائیے اور دیکھئے کہ اس مردِ دانا کی آواز کو نقار خانہ میں طوطی کی آواز سمجھ کر نظر انداز کرنے کا کیا یہ نتیجہ برآمد نہیں ہوا کہ آج ۳۸ برس گذر جانے کے باوجود ہم ایک قوم نہ بن سکے ملک کے نصف حصّہ سے ہمیں ہاتھ دھونے پڑے اور باقی ماندہ ملک کو بھی صوبوں کی خودمختاری کے نقاب میں تخریب کار ملک دشمن حضرات ملک سے باہر بیٹھ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دینے کیلئے کسطرح سرگرمِ عمل ہیں۔

اپریل ۱۹۴۸ء

۱۵ اپریل کا طلوعِ اسلام ایک سو صفحات پر مشتمل ہے سرورق پر علامہ اقبالؒ کی تصویر اور صفحہ ایک پر علامہ اقبالؒ کی یاد میں چند اشعار نقش ہیں۔ اس ماہ کے شمارہ کے "لمعات" میں محترم پرویز صاحب نے حکومت میں نیشنلسٹ مسلمانوں کی دخل اندازی اور مجلس دستور ساز میں سرحدی گاندھی عبدالغفار خان کا "پٹھانستان" کا مطالبہ پیش کرنے پر تنقید اور تبصرہ کرتے ہوئے لکھا۔ دورِ حاضر میں اشتراکیت کو بھی عجیب وغریب حربے کے طور پر استعمال کیا جا رہا ہے جو شرارت پسند شورش پھیلانا چاہیے اس کے لئے آسان طریقہ یہ ہے کہ وہ غریبوں اور مزدوروں کا غمگسار بن کر اسٹیج پر آجائے، دولت مندوں کو گالیاں دینا شروع کر دے اور عوام کے مصائب و مشکلات کو نہایت درد انگیز طریق سے بیان کرکے لوگوں کے جذبات کو مشتعل کرکے آمادہ بہ فساد کر دے۔ عوام اتنا دیکھنے کی زحمت بھی گوارہ نہیں کرتے کہ سرمایہ داروں کے خلاف جذباتِ نفرت پھیلانے والا خود کتنا بڑا سرمایہ دار ہے۔ ان ہی سرحدی گاندھی کو لیجئے، یہ سرحد کے سب سے بڑے زمینداروں میں سے ہیں اور ایک وسیع و عریض رقبۂ زمین کے مالک بنے بیٹھے ہیں۔ نہ معلوم یہ کس اشتراکیت اور کس قرآن کی رو سے جائز ہے۔ ساری عمر ہندوؤں کا آلۂ کار بن کر پاکستان کی مخالفت کرتے رہے اور آج پاکستان کے غمخوار بن بیٹھے۔ محترم پرویز صاحب نے حکومتِ پاکستان کو متنبہ کرتے ہوئے لکھا کہ جن لوگوں کے متعلق روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ وہ مملکتِ پاکستان کے دشمن ہیں انہیں پاکستان دوستی کی منافقانہ آڑ میں اس قسم کی سازشوں کی اجازت نہ دی جائے۔ "مجاہدین کا کیمپ" کے عنوان سے مجاہدینِ کشمیر کے کیمپ کا ایک منظر پیش کرتے ہوئے محترم پرویز صاحب نے جو کچھ لکھا اس کی چند سطور زرینِ اوراق بنا رہا ہوں اس لئے کہ یہ جواہر پارے ہماری تاریخ کا حصّہ ہیں۔

"........ بگل کی آواز مدھم پڑی تو ہر طرف سکوت تھا۔ کامل سکوت۔ جیسے ایک دراز قامت سنِ رسیدہ عفت مآب خاتون کی آواز نے توڑا۔ جس میں مردانہ شکوہ و جلال بھرا ہوا تھا۔ یہ خاتون، مستورات، ماؤں، بہنوں اور بچیوں۔ کے ایک اجتماع میں کھڑی تھی جو اپنے

مردوں۔ اپنے باپ، خاوند اور بھائیوں کو الوداع کہنے کے لئے جمع ہوئی تھیں۔ اس خاتون نے ان مجاہدین کو مخاطب کرکے کہا:۔

تم جا رہے ہو! لیکن جانے سے پہلے میری بات سنتے جاؤ۔ میں تمہارے لئے ایک پیغام لائی ہوں یہ پیغام ہر ماں۔ ہر بیوی۔ ہر بہن اور ہر بیٹی کی طرف سے ہے۔

ہونٹوں کی سرخی اور رخسار کا غازہ عورتوں کی زینت ہے لیکن مردوں کے ہاتھ کی زینت دشمن کا رنگین لہو ہے۔

تم فاتح و منصور واپس آئے تو ہمارے دلوں پر حکومت کروگے اگر تم میدانِ جہاد میں شہید ہوگئے تو ہم اپنے آنسوؤں سے تمہاری یاد منائیں گی۔

لیکن اگر تم دشمن کو پیٹھ دکھا کر بھاگ نکلے تو یاد رکھو۔ تم ہماری لاشوں کو روند کر ہی گھروں میں داخل ہوسکو گے۔

سن لیا ——— اچھا خدا حافظ ——— جاؤ

وراثتِ ارض کا ابدی قانون

محترم پرویز صاحب نے اپنے اس مضمون میں لکھا کہ جس طرح اللہ کے قوانین و ضوابط خارجی دنیا میں جاری و ساری ہیں اسی طرح انسان کی داخلی دنیا میں بھی ان کی حکمرانی ہے۔ اس نظام کی بنیاد اس ایمان پر ہے کہ حاکمیت کا حق صرف خدا کو حاصل ہے اور جس جماعت کے ہاتھوں ان احکام کی تنفیذ ہوگی۔ وہ اپنے ہر قول و فعل میں اپنے خدا کے سامنے جوابدہ ہوگی۔ اس ایمان کی بنیاد پر جو عمارت تعمیر ہوگی اس کا نام عملِ صالح ہے اور ان دونوں کا نتیجہ **استخلاف فی الارض** ہے یہ استخلاف فی الارض کس لئے ہوگی تاکہ وہ نظام نہایت مضبوطی سے قائم کر دیا جائے جو اللہ نے اس کے لئے پسند کیا ہے۔ تاکہ ان کی حالتِ خوف کو کامل امن و سکون سے بدل دیا جائے۔ دنیا کی کوئی قوت ان سے اپنی حاکمیت نہ منوا سکے۔

تقسیمِ ہند کا آئینی پہلو

محترم پرویز صاحب نے ہند کی سیاست کا جو تجزیہ مارچ کے طلوعِ اسلام میں کیا تھا یہ اس کی دوسری قسط ہے اس میں موصوف نے (۳؍جون ۱۹۴۷ء کے اعلانِ پاکستان کا جائزہ تفصیل سے پیش کیا ہے جسے تاریخِ پاکستان کا ایک حصہ کہا جاسکتا ہے اور جو طلوعِ اسلام کے اوراق کی زینت ہے۔

مئی ۱۹۴۸ء

کے طلوعِ اسلام میں "لمعات" کے عنوان سے محترم پرویز صاحب نے لکھا کہ تقاضا یہ ہے کہ پاکستان کا نظامِ حکومت شریعتِ اسلامی کے مطابق ہونا چاہیئے۔ جہاں تک عوام کا تعلق ہے ان کے ذہن میں نظامِ شریعت سے مفہوم نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، عید، بقرہ عید، معراج، شب برات سے زیادہ کچھ نہیں ہوتا۔ اس سے آگے بڑھئے تو اربابِ شریعت کا طبقہ آتا ہے یہاں ایک اور مصیبت شروع ہو جاتی ہے اگر وہ

اہلِ تشیع میں سے ہیں تو ان کے نزدیک اسلامی شریعت حقہ کچھ اور ہوگی، پھر سُنی حضرات میں سے اہلِ حدیث کے نزدیک شریعت نام ہوگی ان تمام جزئیات وتفاصیل کے مجموعہ کا جو کتب روایات میں مذکور ہیں اور اگر وہ اہلِ فقہ ہیں تو شریعت نام ہوگا ان تمام فتاویٰ کا جو آئمہ فقہ نے اپنے اجتہادات سے وقتاً فوقتاً صادر فرمائے اور ان سب کے باہمی اختلافات (بلکہ مخالفت) کا عالم یہ ہے کہ ایک کے نزدیک دوسرے کی شریعت اسلامی نہیں۔ ہزار برس سے ان میں باہمی تضاد وتخالف چلا آ رہا ہے جو رفتہ رفتہ مستقل مذاہب کی صورت اختیار کر چکا ہے۔ یہ ہے پاکستان میں نظامِ شرعی کی تنفید کا مطالبہ کرنے والوں کی حالت۔ موصوف نے لکھا بات بالکل سیدھی سی ہے اسلامی نظام کی اساس اس حقیقتِ کبریٰ پہ ہے کہ اطاعت صرف خدا کی جائز ہے۔ خدا نے اپنی اطاعت کے لئے ہمیں اپنا ضابطۂ قوانین عطا کر دیا ہے جسے قرآن کریم کہتے ہیں اس لئے نظام حکومت خداوندی کا ضابطۂ آئین قرآن کریم ہوگا۔ قرآنِ خدا کی طرف سے نازل شدہ آخری اور مکمل ضابطۂ قوانین ہے اس لئے ہر زمانہ اور ہر ملک کے انسانوں کے لئے ضابطہ اطاعت ہوگا۔ قرآن کریم نے چند متعین احکامات کے علاوہ کہ جن میں تغیّر وتبدّل مقصود نہ تھا، نظامِ اطاعت کے لئے بڑے بڑے اصول - (BROAD - PRINCIPLES) بیان کر دیئے ہیں۔ جن کے تابع ہر زمانہ کے انسان اپنے اپنے زمانہ کی ضروریات کے مطابق علی جزئیات متعین کر سکتے ہیں ان جزئیات کو آپ (BYE LAWS) کہہ سکتے ہیں ان جزئیات کی تشکیل مختلف زمانہ کے اربابِ حل وعقد کے ذمہ ہوتی ہے۔ بس یہ ہیں نظام حکومت اسلامیہ کے خطۂ وخال۔ ذرا سی بات تھی اندیشۂ عجم نے جسے۔ بڑھا دیا ہے فقط زیبِ داستاں کے لئے۔

سلیم کے نام آٹھواں خط تقسیم سے قبل ماہنامہ طلوعِ اسلام میں سلیم کے نام سات خطوط شائع ہو چکے تھے۔ آٹھواں خط ماہ مئی ۱۹۴۸ء کے طلوعِ اسلام میں رونقِ اوراق ہوا ہے۔ محترم پرویز صاحب نے اس خط میں سلیم کو مخاطب کرتے ہوئے وراثتِ ارض۔ صلاحیت اور صالحیت کے مفہوم اور فرق کو وضاحت سے بیان فرمایا ہے۔

جون ۱۹۴۸ء ماہِ جون کا طلوعِ اسلام ۱۰۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ "لمعات" میں حکومت میں نااہل افراد کی بھرتی۔ اسلام میں پردے کی حیثیت۔ مغربی پنجاب کی حکومت کے محکمہ اسلامیات میں ایک "شعبہ تحقیقات" کے قیام۔ ہندوستان کے صوبۂ یوپی میں طلوعِ اسلام کے داخلہ پہ پابندی۔ ارضِ فلسطین۔ اور پاکستان کی مجلس دستور ساز پہ تنقید وتبصرہ شامل ہے۔

پارٹیاں کسطرح ختم ہو سکتی ہیں اس پہ تبصرہ کرتے ہوئے محترم پرویز صاحب نے لکھا۔ ہمارے اربابِ حل وعقد کا ارشاد ہے کہ

مختلف پارٹیوں کا وجود مملکت پاکستان کے لئے سخت خطرناک ہوگا۔ بالکل بجا۔ لیکن وہ اس کا علاج کیا بتاتے ہیں؟ یہ کہ ان کی اپنی پارٹی (مسلم لیگ) موجود رہے اور باقی اس کے علاوہ کوئی اور پارٹی بننے نہ پائے۔ اور اگر بن جائے تو باقی نہ رکھی جائے۔ معترضین کا اعتراض یہ ہے کہ مسلم لیگ کے پاس کون سی آسمانی سند ہے کہ اس کا وجود ضرور رہے اور اس کے علاوہ کوئی اور پارٹی نہ رہے۔ آپ غور کیجئے تو دنیا میں پارٹی بازی اور گروہ بندی کی بنیاد ہی اس غلط اصول پر ہے کہ ایک پارٹی یہ چاہتی ہے کہ میرا وجود ضروری ہے لیکن کوئی دوسری پارٹی میرے مدمقابل نہ آئے۔ اس کی دلیل وہ یہ دیتی ہے کہ میں حق پر ہوں اور دوسری کوئی پارٹی حق پر نہیں۔ لیکن آپ سوچئے کہ بعینہٖ یہی دلیل اس پارٹی کے مدمقابل دوسری پارٹی دے رہی ہوتی ہے چنانچہ اس طرح بیسیوں پارٹیاں وجود میں آجاتی ہیں اور ایک دوسرے کی ضد قائم رہتی ہے۔ پارٹیوں کو ختم کرنے کا ایک ہی طریق ہے اور وہ وہی ہے جسے قرآن کریم نے تجویز کیا ہے کہ کسی پارٹی کا وجود ہی قائم نہ رہے۔ جب پارٹیاں ختم ہو جائیں گی تو باقی ملت رہ جائے گی۔ جس طرح، جب فرقے ختم ہو جائیں گے تو باقی مسلمان رہ جائیں گے اور آگے بڑھیئے تو ——— جب قومیں ختم ہو جائیں گی تو باقی انسانیت رہ جائے گی۔ یہی قرآن کا مقصود ہے۔

جولائی ۱۹۴۸ء اس ماہ کے "لمعات" کی ابتداء اس اقتباس سے ہوتی ہے "ہندوؤں نے سومنات کی جامع مسجد کو جسے ۱۰۲۴ء میں سلطان محمود غزنوی نے تعمیر کرایا تھا زبردستی مندر میں تبدیل کر لیا ہے۔ اس موقعہ پر ہندوؤں نے بہت بڑا جشن منایا جس میں پولیس اور فوج نے بھی شرکت کی۔ مسجد کے ۷۵ سالہ بوڑھے متولی کو باہر نکال دیا گیا اور خدا کے اس گھر میں بت رکھ دیئے گئے اب مسجد میں ناقوس بجتا ہے۔ اور بتوں کی پوجا ہوتی ہے (ڈان ۱۲ جون ۱۹۴۸ء) اس پر تنقید کرتے ہوئے محترم پرویز صاحب نے لکھا یہ ایک مثال ہے استبداد اور قہرمانیت کی۔ ان سینکڑوں مثالوں میں سے جو ہندوستان کے چار کروڑ مسلمانوں پر بلا دریغ و بے محابا وہاں کی ادعائے حریتِ فکر و نظر اور آزادیٔ مذہب و مسلک کی حکومت کی جو نیشلسٹ مسلمانوں کے نزدیک محبوب و محترم ہے ——— اگر ہندوستان کی تقسیم نہ ہوتی تو دس کروڑ مسلمانوں پر وہی بیت رہی ہوتی جو آج چار کروڑ مسلمانوں پر گزر رہی ہے۔ اس تقسیم سے کم از کم پانچ چھ کروڑ مسلمان تو ان کی دراز دستیوں سے بچ گئے۔ صرف اتنا ہی نہیں ہوا بلکہ رزق اور قوت کے ان تمام چشموں کے مالک بن گئے جو اس سے پہلے ہندوؤں کی واحد اجارہ داری میں تھے ——— جو لوگ آج یہ کہتے ہیں کہ تقسیم ہند سے تمام مصیبتیں آگئیں یاد رکھو! وہ تمہارے بدترین دشمن ہیں وہ چاہتے ہیں کہ اللہ کا یہ انعام تم سے چھوٹ جائے۔ ہندوستان کے مظلوم و مقہور مسلمانوں کے مصائب کا یہ حل نہیں کہ چھ کروڑ آزاد مسلمان بھی ان کے ساتھ جا ملیں اور ان ہی مصیبتوں میں مبتلا

ہو جائیں اگر آپ کا ایک بھائی جیل خانہ میں ہے تو کیا اس کی مشکلات کا مداوا اس سے ہو سکتا ہے کہ آپ بھی اس کے ساتھ جیل خانے کی کوٹھڑی میں بند ہو جائیں۔ حل اس کا کچھ اور ہوتا ہے۔

اسلامی نظام اسلامی نظام کے عنوان سے اس شمارہ میں محترم پرویز صاحب نے ایسی بنیادی حقیقت کو اجاگر کیا ہے، جس کی روشنی میں پاکستان میں اسلامی نظام کی ترتیب و تدوین کا مسئلہ ایسا ہی سہل اور عین مطابق فطرت بن جاتا ہے جیسے قرآن کریم کی ہر دوسری تعلیم۔ تشکیل پاکستان کے بعد محترم پرویز صاحب کا یہ پہلا مضمون ہے جو پمفلٹ کی صورت میں بھی شائع کیا گیا۔ موصوف نے لکھا کہ "اسلامی نظام کی بنیاد اس حقیقت کبریٰ پر ہے کہ کسی انسان کو یہ حق حاصل نہیں کہ کسی دوسرے انسان پر حکومت کرے۔ اطاعت صرف خدا کی جائز ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ خدا کی اطاعت کس طرح کی جائے وہ براہِ راست تو کوئی حکم دیتا ہی نہیں نہ ہی ہم سے ہمکلام ہوتا ہے۔ اس کا جواب بھی صاف اور واضح ہے۔ اللہ تعالیٰ جن احکام کی اطاعت چاہتا ہے وہ اس نے بوساطت جناب نبی اکرمؐ انسانوں تک پہنچا دیئے۔ ان ہی قوانین و ضوابط کے مجموعہ کا نام قرآن ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی بار بار وضاحت کر دی ہے کہ اس کی اطاعت قرآنی احکام کی اطاعت سے ہو گی لہٰذا اسلامی نظامِ حکومت کی اساس قرآن کی اطاعت ہے۔ قرآن کریم میں بعض اصول ایسے ہیں جن کی جزئیات بھی متعین کر دی گئی ہیں۔ یہ احکام وہ ہیں جن پر مرورِ زمانہ کا کچھ اثر نہیں ہو گا وہ نا قابلِ تغیر و تبدل ہوں گے۔ باقی اصول ایسے ہیں جن کی صرف حدود متعین کر دی گئی ہیں۔ ان کی جزئیات ہر زمانہ کے انسان اپنی اپنی ضروریات کے مطابق خود متعین کریں گے۔ دیکھنا یہ ہو گا کہ یہ جزئیات حدود سے متصادم نہ ہوں ...... ان تصریحات کے پیشِ نظر کرنے کا کام یہ ہے کہ مجلسِ دستور ساز ملت کے منتخب کردہ اربابِ فکر و نظر کی ایک ایسی کمیٹی متعین کرے جس میں ماہرین قوانین و دساتیر عالم اور وہ حضرات شامل ہوں جو قرآن و تاریخ دین پر غائر نگاہ رکھتے ہوں۔ یہ حضرات قرآن کریم کی حدود میں رہتے ہوئے جزئیات کا تعین کریں۔ یہ مجموعۂ قوانین، ملت اسلامیہ پاکستانیہ کا نظام شریعت ہو گا اور اس میں مزید ضروریات کے ماتحت مناسبِ حال تغیر و تبدل ہوتا رہے گا۔ یہ فریضہ تمام ملت کا مشترک ہے جسے ملت اپنے منتخب کردہ حضرات کے سپرد کرے گی۔ اس میں کسی خاص جماعت کی اجارہ داری نہیں ہو گی۔ قوانین شریعت یا ان کی تفسیر و تعبیر افراد کے ذمہ نہیں رکھی جائے گی۔ اس لئے "برا بو بٹ علماء" کی ضرورت باقی نہیں رہے گی۔ قوانین کی تنفیذ و ترویج بھی ملت کی قائم کردہ حکومت ہی کی ذمہ داری ہو گی۔ وہیں کا فیصلہ فتویٰ کہلائے گا۔

اگست ۱۹۴۸ء

اس ماہ لمعات میں دیگر امور کے علاوہ جونا گڑھ کے پاکستان سے الحاق پر تبصرہ کیا گیا ہے جس میں کہا گیا ہے جونا گڑھ کے نواب نے پاکستان سے الحاق کا فیصلہ کیا تو ہندوستان نے اسے اس بناء پر تسلیم کرنے سے انکار کر دیا کہ وہ عوام کا جمہوری فیصلہ نہیں بلکہ نواب کا ذاتی فیصلہ ہے۔ کشمیر کے مہاراجہ نے عوام کے جذبات کو کچلتے ہوئے ہندوستان سے الحاق کا اعلان کیا تو ہندوستان نے نہ محض اسے تسلیم ہی کر لیا بلکہ اس کے لئے باقاعدہ جنگ مول لے لی۔ حیدرآباد کے نظام نے الحاق کے خلاف فیصلہ کیا تو ہندوستان نے اسے تسلیم نہ کیا نواب نے استصواب کی تجویز پیش کی تو وہ مسترد کر دی گئی حالانکہ فیصلہ یا تو نظام کو کرنا چاہیئے یا ریاستی باشندوں کو لیکن عجیب تماشا ہے کہ ہندوستان کو نہ نظام کا فیصلہ منظور ہے نہ وہ عوام کا فیصلہ قبول کرنے پر تیار ہے۔ نہرو پٹیل ایک ہی تصویر کے دو رخ ہیں۔ انہوں نے حالیہ تقریر میں اعلانیہ کہا ہے کہ حیدرآباد کے تصفیہ کا حل ہندوستان کے ساتھ الحاق ہے یا حیدرآباد کا بہ حیثیت علیحدہ ریاست خاتمہ .... اب تک حیدرآباد کے علاوہ تمام ہندوستانی ریاستیں ہندوستان سے ملحق ہو گئی ہیں۔ الحاق کے ساتھ انہوں نے تخریب کا بھی فیصلہ کر لیا ہے یہ فیصلے تمام کے تمام والیانِ ریاست نے کئے ہیں کہیں بھی یعنی کسی ایک ریاست میں بھی ریاستی باشندوں سے استصواب کی زحمت گوارا نہیں کی گئی نہ اندرونی اصلاحات کو فیصلہ الحاق و تخریب کا پیش خیمہ قرار دیا گیا چونکہ یہ فیصلے تمام ہندوستان کے حق میں تھے اس لئے تسلیم کر لئے گئے۔

سلیم کے نام نواں خط

محترم پرویز صاحب کا سلیم کے نام نواں خط اسی شمارہ میں "اسلامی نظام کے بنیادی اصول" کے نام سے شائع ہوا جس میں تقلید، وحی متلو و وحی غیر متلو۔ زکوٰۃ۔ عقیدہ مجدد اور اجتہاد پر سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے۔

۱۵ اگست

یوم آزادی کی سالگرہ پر محترم پرویز صاحب نے آزادی اور غلامی کا نمایاں فرق واضح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ آیئے یوم آزادی منانا ہے تو عہد کیجئے کہ حقیقی آزادی سے ہمکنار ہو کر رہیں گے۔ اس کی یہی صورت ہے کہ قرآن نے جن اطواق و سلاسل کو ایک بار توڑا تھا اور جن کے ٹوٹے حلقوں کو جوڑ کر ہم نے پھر وہی زنجیریں تیار کر لی ہیں، کو ایک جھٹکے سے توڑیں اور حیاتِ اجتماعیہ کو اس قالب میں ڈھال لیں کہ محکومیت صرف اللہ کی جائز ہے انسان کو انسان پر حکومت کرنے کا حق نہیں۔ انسان حاکم ہے نہ محکوم۔ وہ خدائی قوانین کا نفاذ کرنے والا اور آپس میں ائتلاف اور رحم سے کام لینے والا ہے۔ گویا بالفاظ دیگر ہم قرآن اور اسلام کا نظام اپنے ہاں نافذ کریں اور انسانیت کو حقیقی آزادی سے ہمکنار کرائیں۔

اس موقع پر...... بعید از سپاس گذاری ہوگا کہ ہم قوم کے اس "مخلص وکیل" کا شکریہ ادا نہ کریں جس نے اپنی فراست و دیانت سے اتنا عرصہ بلا مزد و معاوضہ قوم کا مقدمہ لڑا اور اسے اس زمین کا قبالہ لے دیا۔ مسلمانوں کی آنے والی نسلیں اس محسنِ ملت کی زیربار احسان رہیں گی۔ لیکن پاکستان کا استحکام اس "ڈگری" حاصل کر لینے سے نہیں ہوگا۔ یہ مشروط ہوگا ہماری اپنی صلاحیتوں پر اور یہ صلاحیتیں "ایمان و اعمال صالحہ" کے بغیر نا ممکن ہیں۔

قوم پوچھتی ہے

پاکستان کے وزیر مالیات غلام محمد صاحب نے انگلستان کے ایک اخبار کو بیان دیتے ہوئے کہا:-

جب ان حادثات کی تاریخ لکھی جائے گی تو ان کا الزام ایک حد تک، بلکہ تقریباً کامل تاً اس شخص پر آئے گا جو اس وقت وائسرے تھا...... پنجاب کے فسادات ایک گہری سازش کا نتیجہ تھے اس سازش میں ایک طرف سکھوں کا وہ جنگجو طبقہ موجود تھا جو وہاں اپنا راج قائم کرنا چاہتا تھا اور دوسری طرف راشٹریہ سیوک سنگھ کے یہ کمینہ عزائم تھے کہ مسلمان آبادی کا صفایا کر کے پاکستان کا خاتمہ کر دیا جائے۔ تقسیم سے پہلے حکومت ہند کو ان سرگرمیوں کا بخوبی علم تھا لیکن ان کے سدِ باب کے لئے کچھ کارروائی نہیں ہوئی۔ وائسرائے لارڈ مونٹ بیٹن کو پورا علم تھا کہ یہ فتنہ کھڑا کیا جا رہا ہے اسے معلوم تھا کہ اسلحہ جمع کیا جا رہا ہے۔ وہ جانتا تھا کہ سکھ کیا کر رہے ہیں اور مسلمانوں کو کیسے ستایا جا رہا ہے۔ اس کی سی آئی ڈی نے یہ معلومات اسے بہم پہنچا دی تھیں اور اسکے رفقائے کونسل اسے کارروائی کی دہائی دے رہے تھے۔ اس نے کہا "اگلے ہفتے یا اس سے اگلے ہفتے" جب اس کی کابینہ کے مسلم ارکان رخصت ہوئے تو اس نے انہیں بھی تسلی دی۔

یہ تقسیم دو ماہ میں عاجلانہ طور پر بند کر دی گئی اور یہ غلط فیصلہ تھا۔ لارڈ مونٹ بیٹن کی بڑی خواہش تھی کہ وہ صاحب قوت ہونے کا ثبوت دے اور سب کچھ منوا کر چھوڑے۔ پانچ لاکھ آدمی قتل اور زخمی ہوئے ان کے وہ آبائی گھر برباد ہو گئے ہیں جہاں وہ ہزارہ سال سے بستے چلے آ رہے تھے۔

لارڈ مونٹ بیٹن میں بہت سے اوصاف ہیں اور میں ان کا مداح ہوں، لیکن ان میں بہت سے عیب بھی ہیں۔ بیّن اور روشن واقعات کے علی الرغم اپنی بعض کارروائیوں پر بضد ہونا یقیناً سیاست دانی نہیں۔ لارڈ مونٹ بیٹن پاکستان اور ہندوستان کا واحد گورنر جنرل بننا چاہتا تھا۔ یہ خواہش اس پر بھوت کی طرح سوار تھی"۔ (ڈان ۴۸-۶)

(جاری ہے)